دینی و دنیوی تعلیم کا سنگم

قرآن کالج لاہور

ایف اے اور آئی کام میں داخلے شروع ہیں

داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ 31 جولائی 98ء ہے

نتیجہ کے منتظر طلبہ بھی درخواست دے سکتے ہیں

رابطہ کیجئے : پرنسپل قرآن کالج' 191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

ممتاز عالم دین **ڈاکٹر اسرار احمد** امیر تنظیم اسلامی

کی تالیفات' خطابات اور دروس قرآن مجید میں سے

دو تعارفی سیٹوں کا انتخاب مع مکمل فہرست کتب و کیسٹ

10 کتب کا سیٹ (رعایتی قیمت -/65)

1- اسلام کا معاشی نظام 2- راہ نجات
3- فرائض دینی کا جامع تصور
4- نظام خلافت کے خدوخال 5- عزم تنظیم
6- دعوت الی اللہ 7- تنظیم اسلامی کی دعوت
8- نبی اکرم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں
9- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
10- اسلام میں عورت کا مقام

5 کیسٹس کا سیٹ (رعایتی قیمت -/125)

1- امت مسلمہ کے زوال کے اسباب
2- عظمت قرآن مجید
3- ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟
4- نیکی کا حقیقی تصور
5- پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کا لائحہ عمل

نوٹ: یہ سیٹ پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں تنظیم اسلامی کے مقامی دفاتر سے حاصل کئے جاسکتے ہیں مرکزی دفتر سے بذریعہ وی پی یا منی آرڈر طلب کئے جاسکتے ہیں۔ (ڈاک خرچ بذمہ ادارہ)

تنظیم اسلامی پاکستان' 67/A علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور فون 6305110 6316638

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

قرآن اکیڈمی لائبریری
K-36
لاہور

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۷ | ربیع الاول ۱۴۱۹ھ — جولائی ۱۹۹۸ء | شمارہ ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بخیری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

قرآن کالج ـــ نئے داخلوں سے قبل بورڈ سے الحاق

قرآن کالج کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تعلیمی منصوبوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کالج میں ایف اے اور بی اے کے مروجہ نصاب کے علاوہ طلبہ کو اضافی طور پر نہ صرف یہ کہ عربی زبان اور تجوید کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ قرآن حکیم کے منتخب مقامات کے دروس کے ذریعے انہیں دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور اور دینی فرائض کے اجمالی خاکہ سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ گو قرآن کالج میں تدریس کا آغاز آج سے دس بارہ سال قبل ہو گیا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انٹرمیڈیٹ بورڈ اور یونیورسٹی کے ساتھ اس کے الحاق کی نوبت تاحال نہیں آ سکی تھی۔ چنانچہ اس کالج کے طلبہ کی ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں شرکت ابھی تک پرائیویٹ طلبہ کی حیثیت سے ہی ہوتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی کمی تھی جس کا براہ راست اثر داخلوں پر پڑتا تھا۔ اس لئے کہ ایک عام طالب علم کے لئے اس کالج کی حیثیت ایک ٹیوشن سنٹر سے زائد نہیں تھی۔ الحمدللہ کہ اس کمی کی تلافی کا سامان اب فراہم ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں پہلا مرحلہ اس کالج کی رجسٹریشن کا تھا جو بحمد اللہ طے ہو چکا ہے اور اب بورڈ کے ساتھ اس کے الحاق کے ضمن میں بھی تمام ابتدائی مراحل طے پا چکے ہیں اور امید واثق ہے کہ ایف اے اور آئی کام میں نئے داخلوں سے قبل یہ ہفت خواں بھی طے ہو جائے گا ـــ اس ضمن میں جن احباب نے ادارے کے ساتھ خصوصی تعاون کیا ان میں سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ہمارے ایک بزرگ رفیق محمد بشیر وڑائچ صاحب کا نام بہت نمایاں ہے' جنہوں نے اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے اپنی پیرانہ سالی کے باوصف غیر معمولی تعاون کیا اور محکمہ تعلیم سے اپنے سابق روابط اور تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے ادارے کی رہنمائی کی اور مطلوبہ ہدف کو ممکن الحصول بنا دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

☆ ☆ ☆

احباب نوٹ فرمالیں کہ اس سال ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں نئے داخلے سابقہ معمول سے ایک ماہ قبل یعنی اواخر اگست تک مکمل کر لئے جائیں گے اور تدریس کا آغاز ان شاء اللہ ۷ ستمبر سے ہو جائے گا۔ قبل ازیں تدریس کا آغاز اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوتا تھا۔ ○○

ڈاکٹر اسرار احمد

۲۲

وَمَنْ يَّقْنُتْ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا○ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○ ﴾ (الاحزاب : ۳۱، ۳۲)

قرآن مجید کا بائیسواں پارہ "وَمَنْ يَّقْنُتْ" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ اس میں اولاً سورۃ الاحزاب کی بقیہ تہتالیس آیات شامل ہیں۔ پھر سورۂ سبا، پھر سورۂ فاطر اور آخر میں سورۂ یٰسین کی اکیس آیات ہیں۔

سورۃ الاحزاب کا جو حصہ اس پارے میں ہے اس میں اکثر و بیشتر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین یعنی امّتِ مسلمہ کی ماؤں سے خطاب ہے اور درحقیقت ان کی وساطت سے تمام مسلمان خواتین کو ہدایات دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں بھی سورۃ النّور ہی کی طرح اسلامی تہذیب و تمدن بالخصوص مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے متعلق ہمیں بڑی تفصیلی ہدایات ملتی ہیں۔ آنحضورؐ کی ازواجِ مطہّرات سے ارشاد ہوتا ہے: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا○ ﴾ (آیت ۳۳) اے نبیؐ کے گھر والو! اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر گندگی، ہر برائی، ہر نجاست

کو دور کردے اور تمہیں پاک کردے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ یہ احکام جو دیئے جا رہے ہیں' یہ درحقیقت تمہیں کسی تنگی میں ڈالنے کے لئے نہیں بلکہ اسلامی معاشرے کو برائی' فحش اور بدکاری سے پاک کرنے کے لئے ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں ازواجِ مطہرات' حضورؐ کی بنات اور عام مسلمان خواتین کے لئے حکم ہوا : ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ (آیت ۵۹) اے نبیؐ' اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مومنین کی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر انہیں کبھی کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو انہیں چاہئے کہ اپنی بڑی چادریں سامنے لٹکا لیا کریں۔ گویا کہ پردے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اسی سورۂ مبارکہ میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اگر کبھی نبیؐ کی ازواجِ مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو : ﴿ فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ (آیت ۵۳) آیۂ مبارکہ میں جو لفظ "حجاب" وارد ہوا ہے اس پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہئے جنہیں یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ قرآن مجید میں پردے کا حکم نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کی تہذیبی زندگی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں تفصیلی احکام دیئے ہیں۔

اس کے علاوہ اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کی شان بھی بڑی جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی۔ فرمایا : ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (آیات ۴۵'۴۶) اے نبیؐ ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر (اللہ کی توحید کا گواہ' حق و صداقت اور عدل و راستی کا گواہ) اور مبشّر بنا کر (بشارت دینے والا راستبازوں کو) اور نذیر بنا کر (خبردار کر دینے والا کج روؤں کو اور غلط روی اختیار کرنے والوں کو) اور "داعیًا اِلَی اللّٰہ" (اللہ کی طرف بلانے والا) اور "سِراجًا مُنیرًا" ہدایت کا ایک روشن چراغ بنا کر۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ان پانچ الفاظ میں واقعتاً بڑی جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں حضورؐ کی ختمِ نبوّت کا

اعلان بھی ہوا ہے : ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ..﴾ (آیت ۴۰) یعنی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ اللہ نے آپؐ کو بیٹیاں تو دی ہیں لیکن مسلمانوں میں سے کوئی مرد آپؐ کا بیٹا نہیں ہے' حضرت زیدؓ آپؐ کے منہ بولے بیٹے ضرور تھے لیکن ان کو دین میں اور شریعت میں بیٹے کا مقام حاصل نہیں ہے۔ وہ تو اللہ کے رسولؐ ہیں' دین کی تکمیل اور اِتمام کے لئے تشریف لائے ہیں اور نبوّت کے دروازے پر گویا کہ مہر ہیں' جو کہ اب انؐ کی آمد پر بند ہو چکا ہے۔ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا اختتام بھی بڑے جامع الفاظ میں ہوا ہے : ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آیات ۷۰'۷۱) اے اہلِ ایمان' اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنی زبان کی محافظت کرو کہ اس سے کوئی غلط بات نہ نکلنے پائے۔ اس سے وہی بات نکلے جو درست ہو اور صحیح ہو۔ اس کے نتیجے میں اللہ تمہارے عمل کو بھی درست کر دے گا اور تمہاری خطائیں بھی معاف فرمائے گا۔

اس کے اخیر میں یہ بھی فرمایا کہ اے انسانو تم ایک عظیم امانتِ الٰہی کے حامل ہو' وہ امانت کہ جس کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ : ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ...﴾ (آیت ۷۲) وہ امانت کہ جس کو نہ پہاڑ اٹھا سکے نہ آسمان نہ زمین۔ یہ وہ امانت ہے کہ ؎ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند یہ امانت وہ روحِ ربّانی ہے جو اس انسان کے خاکی پتلے میں پھونکی گئی ہے۔ انسان کو اپنا مقام پہچاننا چاہئے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ؎ اپنی خودی پہچان او غافل "انسان"!

اس کے بعد سورۂ سبا اور سورۂ فاطر میں اکثر و بیشتر وہی مضامین ہیں جو اکثر مکّی سورتوں میں اسلوب اور اندازِ بیان کے معمولی فرق کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ وہی

توحید کی دعوت' وہی معاد یعنی آخرت کا اثبات' وہی نبوت اور رسالت کا اثبات۔ سورۂ سبا میں حضرت داؤد علیہ السلام کا بھی ذکر ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی۔ مزید برآں سَیلِ ارم کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یعنی وہ سیلاب جو آبپاشی کے لئے تعمیر شدہ ایک بڑے بند کے ٹوٹنے سے یمن کی سرزمین میں آیا' اور جس کے بعد وہاں کے لوگ ایک بڑی عظیم ہلاکت سے دوچار ہوئے اور وہ زمین ویران ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد قرآن مجید میں سورۂ فاطر وارد ہوئی ہے اور اس کے بعد سورۂ یٰسین آتی ہے' جسے نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کا دل قرار دیا ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ جس کا اکثر حصہ تو اگلے پارہ میں ہے' اس کا آغاز ہوتا ہے : ﴿یٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ (آیات ۱'۲) "قسم ہے قرآن حکمت والے کی" یہ قرآن بڑی ہی حکمت کی حامل کتاب ہے۔ اس کے مضامین بڑے محکم ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے سورۂ ہود کے آغاز میں فرمایا گیا : ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝﴾ قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان کا مدّعا بالعموم گواہی کا ہے۔ یہ حکمت والا قرآن اس پر گواہ ہے کہ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ اے محمدؐ! آپ یقیناً اللہ کے رسولوں میں سے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا عظیم ترین معجزہ قرآن حکیم ہے۔ آپؐ کی نبوّت اور رسالت کا سب سے بڑا ثبوت قرآن حکیم ہے۔ سابق انبیاء کو بھی بڑے بڑے معجزے دیئے گئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور یدِ بیضا کے معجزے عطا ہوئے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بڑے بڑے معجزے احیائے موتیٰ یعنی مُردوں کو زندہ کر دینا' مٹی سے پرندے بنا کر ان میں پھونک مارنے سے ان کا اڑتے ہوئے پرندوں کی شکل اختیار کر لینا' بڑے عظیم معجزات ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب ہیچ ہیں قرآن حکیم کے مقابلے میں۔ اس لئے کہ وہ تمام معجزات صرف ان رسولوں کی زندگیوں تک تھے جنہیں وہ عطا کئے گئے' اور یہ

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

درس ۱۱

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

(۲)

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ○ ﴾ (الفرقان : ۷۰'۷۱)

"سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کئے' تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں اور نیکیوں سے بدل دے گا' اور اللہ تو ہے ہی مغفرت فرمانے والا' رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے تو وہی ہے جو توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔"

ان دو آیات کا مضمون ان سے پہلی دو آیات سے مربوط ہے' جن میں تین بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا گیا' یعنی شرک' قتل ناحق اور زنا ــــــ اور فرمایا گیا کہ جو کوئی ان جرائم کا مرتکب ہو گا اسے سزا مل کر رہے گی' اور سزا بھی وہ جس میں اضافہ ہوتا رہے گا' اور پھر اس کے لئے خلود یعنی ہمیشہ ہمیش کے لئے سزا ہے۔ تو یہ نقشہ بعض اعتبارات سے خاصا مایوسی پیدا کرنے والا ہے کہ اگر کسی شخص سے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہو تو گویا یہ صورت حال اس کے لئے بڑی مایوس کن ہو گی۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں اگلی دو آیات اُمید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہیں۔

فرمایا : ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ ﴾ ہاں جو توبہ کرلے وہ بچ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ گناہ کے اثرات اشیاء کے مادی اور طبعی اثرات کی طرح نہیں ہیں کہ ان کا ظہور لازماً ہو۔ جیسے اگر آپ نے آگ میں انگلی ڈالی تو وہ لازماً جل کر رہے گی۔ اس کے بعد اگر آپ توبہ کریں تو اس توبہ سے آگ کا اُنگلی پر جو اثر ہوا ہے وہ زائل نہیں ہوگا' وہ جلی رہے گی۔ اس لئے کہ یہ ایک طبعی اثر (Physical Effect) ہے۔ لیکن اخلاقی جرائم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی گناہ ہوا ہو' کوئی خطا ہوئی ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور ظاہر ہو۔ بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے' اور وہ درحقیقت توبہ کا راستہ ہے۔ توبہ کی عظمت اور توبہ کی حقیقت کے بیان میں قرآن کا یہ مقام نہایت اہم ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے اس کو قرآن مجید کی چوٹی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ توبہ کی اہمیت کیا ہے! انفرادی اعتبار سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اگر انسان اس مغالطہ میں مبتلا ہو کہ مجھ سے جو خطا ہو چکی ہے اس کی سزا تو مجھے لازماً بھگتنی پڑے گی' تو انسان پر مایوسی مسلط ہو جائے گی اور اصلاح کے لئے جو ہمت اور ارادہ درکار ہے' وہ اس میں باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ کتب احادیث میں ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ ملتا ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں' ان میں سے کسی اُمت کے ایک فرد کا یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑا سفاک قاتل تھا' اس نے ننانوے انسانوں کو قتل کیا تھا۔ لیکن پھر اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی تو وہ ایک بہت بڑے عالم کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں ننانوے انسانوں کو قتل کر چکا ہوں' کیا اب بھی میری مغفرت کا کوئی راستہ کھلا ہے؟۔ اُس عالم نے کہا کہ نہیں' تمہاری مغفرت کی اب کوئی سبیل نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اُس عالم کو بھی قتل کر دیا کہ میں ننانوے قتل تو پہلے ہی کر چکا ہوں' سو کیوں نہ پورے کر لوں! ـــــ پھر اس نے ایک اور بڑے عالم کی طرف رجوع کیا۔ اس نے بتایا کہ نہیں' اللہ کی مغفرت و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا' اگر تم اب بھی صدق دل سے توبہ کرو تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ پھر اس عالم نے اس کی

رہنمائی بھی کی کہ فلاں جگہ چلے جاؤ' وہاں تمہیں بہتر ماحول ملے گا۔ تم اب تک جس ماحول میں رہے ہو اگر تم اسی میں رہے تو شاید تم اپنی اصلاح نہ کر سکو۔ وہ شخص اپنی اصلاح کے ارادہ سے اس مقام کی طرف چل پڑا جس کی رہنمائی اس عالم نے کی تھی۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آ گیا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں فرشتوں کے مابین یہ اختلاف رونما ہوا کہ اس کی رُوح کو عذاب والے فرشتے قبض کر کے لے کر جائیں یا رحمت والے فرشتے! اللہ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ راستہ ماپ لو۔ وہ راستہ جس طرف وہ اصلاح احوال کی غرض سے قیام کے ارادہ سے چلا تھا اگر اس راستہ سے کم رہ گیا ہے جو وہ طے کر چکا ہے تو اس کی روح کو رحمت کے فرشتے لے کر جائیں' بصورت دیگر اُس کی روح کو عذاب والے فرشتے لے کر جائیں۔ راستہ ماپا گیا تو جس مقام کے ارادہ سے وہ شخص چلا تھا وہ راستہ کم پایا گیا' لہٰذا رحمت والے فرشتے اس کی رُوح کو لے کر برزخ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو وہ راستہ جو ابھی طے کرنا باقی تھا وہ سمٹ گیا' جبکہ وہ راستہ جو وہ طے کر چکا تھا وہ پھیل گیا۔

تو یہ ہے توبہ کا معاملہ انفرادی اصلاح کے ضمن میں کہ انسان جب بھی جاگ جائے' جب بھی ہوش میں آ جائے' اگر سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی اُمید دلائی ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ خواہ اس کے گناہوں کا ڈھیر کوہ اُحد جتنا بلند ہو تب بھی سچی توبہ کے عوض اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اور مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید افزاء آیت سورۃ الزمر کی یہ آیت ہے :

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾

"(اے نبی) فرما دیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ! اللہ تمام گناہ بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا۔"

دنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفۂ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت

ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطۂ نظر بہت کج ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو خطا ہو گئی تھی، جب کہ اُنہیں آزمائشی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا اور ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا مگر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھا لیا تھا، تو یہ گناہ گویا اب نسل آدم میں منتقل ہو رہا ہے۔ نوع انسانی کا جو بچہ پیدا ہو رہا ہے وہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہوتا ہے، وہ اپنے جد امجد کے گناہ کی گٹھری لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں یہ غلط عقیدہ ہو گا وہاں اس پر مزید غلطیاں ہوں گی۔ چنانچہ پھر "کفّارہ" کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ یہ بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ضرور ہوئی تھی، لیکن انہوں نے توبہ کی :

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف : ۲۳)

"اے رب ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو لازماً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

اور سورۃ البقرہ میں فرمایا :

﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾

"آدم نے کچھ کلمات اپنے رب سے حاصل کئے (اور جب ان کلمات کے ذریعے اللہ سے توبہ کی) تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔"

مزید یہ کہ توبہ کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی کتب احادیث میں موجود ہے :

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ))

"جو کوئی کسی گناہ سے توبہ کر چکا اس کے لئے کوئی گناہ ہے ہی نہیں۔"

گویا وہ ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اب اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ نسل آدم علیہ السلام کا ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہو ـــــــ معاذ اللہ۔ قرآن مجید کا فیصلہ تو یہ ہے :

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ﴾ (الرُّوم : ۳۰)

"اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔"

حضور ﷺ نے فرمایا :

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ' فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ)) (متفق علیہ)

یعنی نسل آدم کا ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے' وہ تو اس کے والدین ہیں جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید کے فلسفہ میں اور بعض دوسرے مذاہب کے فلسفہ میں یہ بڑا عظیم فرق و تفاوت ہے۔

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ توبہ کی شرائط کیا ہیں! صرف زبان سے کہہ دینے سے توبہ نہیں ہو جائے گی۔ توبہ کی چند شرائط اور کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پڑھتا رہے اور صرف زبانی طور پر استغفار کا کتنا ہی ورد کرتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں "ریاض الصالحین" میں توبہ کے باب میں علمائے اُمت کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اگر توبہ کسی ایسے گناہ کے ضمن میں ہو جو حقوق اللہ سے متعلق ہے تو اس کے صحیح ہونے کی تین شرائط ہیں۔ لیکن اگر کوئی گناہ حقوق العباد کے ضمن کا ہے تو ایک اضافی شرط مزید شامل ہو جائے گی۔ پہلی تین شرائط حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں مشترک ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں سچی اور حقیقی ندامت ہو کہ میں اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں' غلط کرتا رہا ہوں۔ اس پر واقعی پشیمانی ہو۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے نوعمری کے دور کے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے' جسے داغ دھلوی نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر داد دی تھی کہ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اللہ کو بندے کی یہ پشیمانی اور ندامت بہت محبوب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عزمِ مصمم ہو کہ اب یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ فی الواقع اُس گناہ کو ترک کردے اور عمل صالح کی روش اختیار کرے۔ یہ تین شرائط حقوق اللہ کے ضمن کے گناہوں سے متعلق ہیں ـــــ اضافی چوتھی شرط حقوق العباد کے معاملے میں ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کرے، کسی کا مال ہڑپ کیا ہے تو وہ مال واپس کرے یا اُس سے معافی طلب کرے، کسی کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس جا کر معافی چاہے، کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کے لئے مظلوم سے عفو اور درگزر حاصل کرے۔ اس لئے کہ یہ جو حقوق العباد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اگر اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حق تلفی کی گئی ہے معافی حاصل نہیں کی جائے گی تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہوگا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اُس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے وزن اعمال کے پلڑے میں ڈال دیئے جائیں گے۔

چنانچہ اس آیت پر غور کیجئے، فرمایا : ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا ﴾ یہاں صرف ایک لفظ "تَابَ" نہیں آیا، بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کا ذکر بھی ہے۔ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا، پلٹنا، رجوع کرنا ـــــ تو فرمایا : ﴿ مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ ﴾ "جو توبہ کرے اور ایمان لائے"۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ پہلے کافر تھا، اب ایمان لا رہا ہے تو وہ بھی کفر سے پلٹنے اور ایمان لانے کے اعتبار سے ان الفاظ مبارکہ کے ذیل میں آجائے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ مسلمان تھا اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی گناہ کر رہا تھا تو درحقیقت اس گناہ کی وجہ سے جو قلبی یقین والا ایمان ہے وہ زائل ہو گیا تھا۔ اب جب وہ توبہ کر رہا ہے تو گویا تجدید ایمان کر رہا ہے اور اس کے دل میں از سرنو ایمان داخل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل کر پرندے کے مانند اس کے سر پر منڈلاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل میں لوٹ آتا ہے"۔ لہٰذا جب دل میں تصدیق قلبی والا اور یقین والا ایمان ہو تو اس کے اثرات لازماً عمل پر مترتب ہوں گے اور وہ درست ہو

جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے فوراً بعد ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا گیا۔

پھر اس توبہ' تجدیدِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مرتبہ اور مقام کا ذکر بایں الفاظِ مبارکہ فرمایا : ﴿ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ﴾ "پس ایسے لوگوں کے نامۂ اعمال میں سے اللہ ان کی برائیوں کو محو فرما کر ان کی جگہ نیکیوں کا اندراج فرما دے گا۔" یہ ہے اللہ کی نگاہ میں توبہ کی عظمت۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوتا ہے : ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ "اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا" ـــــ اس کی ذات والا صفات میں مغفرت و رحمت کی شانیں بدرجۂ اتم موجود ہیں ـــــ لہٰذا ایک مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ گناہ کی معافی کے لئے اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے لوگوں کے لئے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں' بشرطیکہ وہ اس کی جناب میں پورے لوازم و شرائط کے ساتھ توبہ کریں۔

اگلی آیت میں اس بات کو پھر دُہرایا گیا۔ عمل صالح توبہ کی شرط لازم ہے۔ انسان توبہ توبہ کہتا رہے اور اس کا عمل وہی رہے جو پہلے تھا تو یہ توبہ نہیں ہے' یہ تو اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ فرمایا : ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴾ "جو شخص توبہ کرے اور عمل درست کرے تو وہ ہے کہ جو اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔"

عباد الرحمٰن کے اوصاف کے ضمن میں اگلی آیات میں فرمایا گیا :

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ' حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ ﴾

(الفرقان : ۷۲ تا ۷۶)

"اور وہ لوگ جو جھوٹ میں شرکت گوارا نہیں کرتے اور اگر اتفاقاً کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں' اور وہ

جنہیں جب اپنے رب کی آیات کے ذریعے سے تذکیر اور نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر گر نہیں پڑتے۔ اور وہ جو کہتے ہیں : اے ہمارے رب! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک' اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جنہیں بدلے میں دیئے جائیں گے بالاخانے بسبب ان کے صبر کے' اور اُن کا استقبال ہوگا جنت میں دُعا اور سلام کے ساتھ۔ رہیں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیش۔ بہت ہی اچھی ہے وہ جگہ مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی' اور تھوڑی دیر قیام کے لئے بھی۔"

سورۃ الفرقان کی مندرجہ بالا آیات میں پھر وہی مضمون آیا ہے جو اس سے پہلے اس رکوع کی تیسری آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک آیا تھا۔ یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف۔ گویا وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں۔ اس رکوع کی تیسری سے آٹھویں آیت تک چھ اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے' جن میں سے پہلا وصف تواضع ہے یعنی وہ لوگ جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں' ان کی چال سے عجز و انکسار اور تواضع کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری صفت خواہ مخواہ کی بحث و تمحیص سے دامن بچانا ہے۔ اللہ کے ان محبوب بندوں سے جب مشتعل مزاج لوگ خواہ مخواہ حجت بازی پر اتر آتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے جدا ہو جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ شب کی عبادت میں اللہ کے محبوب بندے اپنی راتیں اللہ کے حضور سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴾ چوتھی صفت جہنم سے پناہ مانگتے رہنا بیان ہوئی' کہ اے رب ہمارے! ہمیں عذاب جہنم سے بچالے۔ ان کی پانچویں صفت میانہ روی ہے' بالخصوص خرچ کے معاملہ میں : ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ چھٹی صفت کبیرہ گناہوں سے بچتے رہنا' جس کا ذکر سورۃ الشوریٰ اور سورۃ النجم میں بایں الفاظ مبارکہ آیا ہے : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ﴾ "وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بالفعل مجتنب رہتے ہیں"۔ اور ہم کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ از روئے قرآن مجید کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے اور چوٹی کے گناہ تین ہیں : شرک' قتل ناحق اور زنا۔

ان چھ اوصاف کے ذکر کے بعد ایک ضمنی بحث توبہ کی عظمت' توبہ کی حقیقت' توبہ کی اہمیت اور توبہ کی شرائط کے بارے میں آ گئی تھی۔ اب مضمون پھر اسی سلسلہ گفتگو کی طرف لوٹ رہا ہے یعنی عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا کیا ہوتے ہیں۔

یہاں پہلا وصف بیان ہوا : ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ﴾ زُوْر جھوٹ کو کہتے ہیں اور شَهِدَ يَشْهَدُ کا معنی موجود ہونا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ جھوٹ پر اپنی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہیں جھوٹ کا معاملہ ہو رہا ہو' کہیں جھوٹ کی بنیاد پر لین دین ہو رہا ہو' کہیں کوئی سازش ہو رہی ہو' کہیں کچھ جھوٹ گھڑے جا رہے ہوں تو ایسی جگہوں پر انہیں اپنی موجودگی تک گوارا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جھوٹی گواہی اس میں از خود آ جائے گی۔ جو لوگ جھوٹ میں ادنیٰ درجہ کی شرکت اور شمولیت گوارا نہیں کرتے' وہ جھوٹی گواہی کیونکر دیں گے؟

دوسرا وصف ہے : ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ ﴾ یعنی وہ لوگ کہ جن کا کسی لغو اور بیکار کام کی طرف قصد اور ارادہ کر کے جانا تو سرے سے خارج از بحث ہے ہی' اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے' مثلاً راہ چلتے ہوئے جب دیکھیں کہ کوئی مداری تماشا دکھا رہا ہے تب بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے' بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات میں آ چکا ہے : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ لیکن یہاں جو فرق ہے اسے نوٹ کر لیجئے کہ ایک ہے لغو کام کا ارادہ کرنا۔ لیکن یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ اللہ کے یہ محبوب بندے کوئی لغو اور بے کار کام کریں۔ اگر اتفاقاً بھی کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ باعزت طور پر اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اصل میں مومن کو اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے۔ یہ محدود سا وقت اور محدود سی فرصت جو اِس دنیا میں حاصل ہے یہ بڑی قیمتی ہے۔ اس لئے کہ اِس کے نتائج اُس دنیا میں نکلیں گے جو لامحدود ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے اعتبار سے اس زندگی کا ہر لمحہ امر ہے۔ اس کا ثمرہ اُس زندگی میں ملے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے پاس کوئی فالتو وقت نہیں ہوتا کہ اُسے بیکار کاموں میں صرف کریں۔

تیسرا وصف یہ بیان ہوا کہ جب انہیں ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے : ﴿ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ ﴾ اس میں کفار کی طرف ایک تعریض ہے کہ انہیں جب آیات الٰہی سنائی جاتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ان کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ وہ غور ہی نہیں کرتے' سنتے ہی نہیں' تدبّر ہی نہیں کرتے۔ پہلے ہی سے طے کئے بیٹھے ہوتے ہیں کہ اعتراضات وارد کریں۔ یہ معاملہ مذکورہ بالا اوصاف کے حامل عباد الرحمٰن کا نہیں ہوتا ہے۔ اس قدر (value) کو اگر ہم مثبت طور پر معین کریں تو وہ یہ ہوگی کہ آیاتِ قرآنیہ پر' آیاتِ ربانیہ پر تدبّر و تفکّر ہو' ان پر غور کیا جائے' انہیں گوشِ حقیقت نیوش سے سنا جائے۔ انسان ان آیاتِ الٰہیہ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرے۔

چوتھا وصف انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ جو شخص خود نیک ہوگا اور سیدھے راستہ پر زندگی بسر کر رہا ہوگا' لازماً اس کی تمنا ہوگی کہ اس کے اہل و عیال بھی اسی راستہ پر چلیں' اور وہ بھی تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ لہٰذا وہ اپنے رب سے دُعا کرتے رہتے ہیں کہ : ﴿ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ "اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔" ایک مومن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اسی میں ہے کہ اُس کی اولاد بھی ایمان و اسلام اور تقویٰ و احسان کے راستہ پر گامزن ہو' اس کے گھر میں بِرّ و تقویٰ کا ماحول ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمارے قریب کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال بڑی عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عطا فرمائے' شاہ عبد القادر' شاہ عبد العزیز' شاہ عبد الغنی' اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ۔ یہ چاروں نہایت نیک اور نہایت پارسا تھے۔ ان میں سے دو بیٹے تو وہ ہیں (یعنی شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین) جنہوں نے قرآن مجید کے اردو میں اولین ترجمے کئے اور آج تک مستند ترین ترجمے وہی ہیں۔ تیسرے بیٹے نے دہلی میں درس گاہ قائم کی جو مدرسہ شاہ عبد العزیز کے نام سے مشہور ہے جس سے بِرِّ عظیم پاک و ہند میں بہت علم پھیلا۔ جبکہ چوتھے بیٹے شاہ عبد الغنی کا نوجوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا' لہٰذا کسی علمی میدان میں ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکیں۔ تاہم اس کی تلافی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمادی

کہ آگے ان کے بیٹے شاہ اسماعیل شہیدؒ تھے' اور ان کا نام اپنے اس نامور عالم و مجاہد اور شہید بیٹے کی وجہ سے روشن ہوا۔ تو آپ غور کیجئے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو اپنی اولاد کو اِن کیفیات میں دیکھ کر کس قدر آنکھوں کی ٹھنڈک میسر آتی ہو گی!

اس کے بعد فرمایا : ﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ اور وہ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ "ہمیں متقیوں کا امام بنا دے"۔ ان الفاظ سے یہ مضمون بھی متبادر ہو سکتا ہے کہ یہ دعا کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کا امام اور پیشوا بنائے' نیک لوگوں کے آگے چلنے والا بنائے۔ اگرچہ اس کی خواہش رکھنا بھی کوئی بری بات نہیں ہے' لیکن جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آ رہے ہیں' اس کے اعتبار سے ان کا مفہوم کچھ دوسرا ہے۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعے پہلی بات ہی کی مزید تاکید ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے اہل و عیال کا امام ہے۔ قیامت کے روز جب لوگ اُٹھیں گے تو ان کے پیچھے ان کی نسلیں چلی آ رہی ہوں گی' ان کی اولاد و اَخلاف ان کے پیچھے چلے آ رہے ہوں گے۔ تو گویا وہی بات ذرا اسلوب بدل کر کہی گئی ہے کہ اے رب ہم جن کے امام ہیں' ان کو متقی بنا دے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والے' ہماری آئندہ نسلیں فُسّاق و فُجّار پر مشتمل ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) یعنی "تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ جیسے بھیڑ بکریاں چرانے والا ایک چرواہا ہوتا ہے اور چند بھیڑ بکریاں اس کی ذمہ داری ہوتی ہیں' شام کو اگر کوئی بھیڑ یا بکری لوٹ کر نہ آئی تو اس سے پوچھا جائے گا' وہ ان کے بارے میں مسئول ہے۔ اسی طرح تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے' اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد تمہارے حوالے کر دیئے ہیں' وہ تمہاری بیویاں ہیں' تمہاری اولاد ہیں' وہ تمہارے زیر کفالت ہیں' وہ تمہارے زیر تربیت ہیں' یہ تمہارا وہ گلہ ہے جس کے بارے میں اللہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے ان کی صحیح رخ پر تعلیم و تربیت کا کتنا اہتمام کیا؟ انہیں اللہ کے نیک اور متقی بندے بنانے کے لئے کتنی محنت کی؟ یہ ہے مفہوم اس ارشاد نبویؐ کا ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ

رَعِیَّتِہٖ)) چنانچہ ہر بندۂ مومن کی یہ دُعا ہونی چاہئے کہ اے اللہ' جو کُلّہ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے' جس کی ذمّہ داری تو نے مجھے سونپی ہے' اس کو توفیق دے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کی روش اختیار کرے' اور ہم کو ایسے متقیوں کا امام بنا: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا﴾

آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جزا کے طور پر جنت میں بالاخانے ملیں گے بسبب ان کے صبر کے"۔ اس آیت میں گویا عباد الرحمٰن کا چھٹا اور نہایت اہم وصف آگیا۔ بِمَا صَبَرُوْا' یعنی یہ درحقیقت بدلہ ہے اُس صبر کا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں کیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ العصر کے ذیل میں بھی پڑھ چکے ہیں اور سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ﴾ ظاہر بات ہے کہ یہ تمام اوصاف انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ ہو' تبھی وہ دنیوی لذات و ترغیبات سے کنارہ کشی کر سکیں گے' ہوائے نفس سے اجتناب کر سکیں گے' اور شیطان کے اغوا سے بچ سکیں گے۔ یہ سب کام اُسی وقت ممکن ہوں گے جب ان میں صبر کا مادہ ہو گا۔ پھر دنیا میں نیکی' راست بازی اور صداقت شعاری کا راستہ اختیار کرنے والوں کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ ان آزمائشوں پر صبر کر کے ہی وہ برو تقویٰ کی راہ پر مستقیم رہ سکیں گے۔ جیسے سورۃ حم السجدہ کی آیات میں ہم نے پڑھا تھا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ تو یہ استقامت اور یہ صبر ہی درحقیقت وہ جوہر ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دنیا میں وہ روش اختیار کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا ـــــ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ: ﴿وَیُلَقَّوْنَ فِیْھَا تَحِیَّۃً وَّسَلٰمًا﴾ "ان لوگوں کا جنت میں استقبال ہو گا دعاؤں کے ساتھ اور سلام کے ساتھ"۔ ظاہر بات ہے کہ یہ استقبال کرنے والے جنت کے فرشتے ہوں گے۔

آگے فرمایا: ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ "اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے"۔ جنت وہ جگہ ہے کہ ایک بار داخلے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ﴿حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ "وہ جنت بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل رہنے کے لئے بھی اور تھوڑی سی دیر کے قیام کے لئے بھی"۔ اس رکوع میں پہلے جہنم کا ذکر آیا تھا' اب یہاں جنت کا ذکر تقابل

(contrast) کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ کتنی ہی عمدہ جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اُس میں انسان کے لئے کوئی دلچسپی اور رعنائی نہیں رہتی اور اگر بُری سے بُری جگہ پر بھی تھوڑی سی مدت کے لئے جانا ہو' جیسے صحرائے اعظم میں انسان تھوڑے عرصہ کے لئے چلا جائے تو تبدیلی (change) کی وجہ سے ایک تفریح ہو جاتی ہے' ایک مہم جوئی کا احساس ہوتا ہے۔ تو جہنم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی بُری جگہ ہے کہ مستقل جائے قرار کی حیثیت سے تو انتہائی خوفناک ہے ہی' اگر کوئی ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں داخل کر دیا جائے تو اس دوزخ کی تمام شِدّتیں' غِلظتیں اور ساری کُلفتیں آنِ واحد میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جنت وہ جگہ ہے کہ وہاں تھوڑی دیر ہی نہیں بلکہ مستقل قیام ہو گا' لیکن اس کے حسن میں' اس کی رعنائیوں میں' اس کی دلچسپیوں میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور انسان اس سے کبھی بھی نہیں اکتائے گا۔

آخر میں ارشاد فرمایا :

﴿ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝ ﴾ (الفرقان : ۷۷)

"(اے نبی ﷺ)! فرما دیجئے : میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہارا پکارنا' سو تم جھٹلا چکے ہو' اب اس کی سزا جلد ہی تمہیں چمٹ کر رہے گی۔"

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اور اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بڑا گہرا ربط و تعلق ہے۔ پہلی آیت مبارکہ ہے :

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ ﴾

"بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان اپنے بندے پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن جائیں۔"

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے اجزاء ہیں : (۱) ایمان باللہ یا توحید' (۲) ایمان بالآخرۃ یا معاد' اور (۳) ایمان

بالرّسالت۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی ہیں۔ فرمایا گیا : ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ ﴾ میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ ایمان باللہ ہے۔ سورۃ الفرقان کی پہلی اور آخری آیت کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجتا رہا! نبوت و رسالت کی غرض و غایت کیا ہے! سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے۔ فرمایا :

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ ﴾

"ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے رہے ہیں تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی غالب، حکمت والا۔"

معلوم ہوا کہ رسولوں کو بھیجنے کا ایک اہم مقصد "اتمامِ حجت" اور "قطعِ عذر" تھا تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! ہمیں پتہ نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تجھے کون کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے! اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں سماعت و بصارت، عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز جیسی بہت سی چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے اور یہ بنیادی اور ابتدائی حجت ہے جو ہر انسان پر قائم ہے، لیکن اتمامِ حجت تب ہوتا ہے جب رسول تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ رسولوں نے حق کو قولاً اور عملاً پیش کر دیا۔ سچ بولنے کی ترغیب دی تو ساری عمر سچ بول کر دکھایا۔ دیانت اور امانت کی تلقین کی تو اپنی زندگیوں میں دیانت و امانت کا نمونہ پیش فرما دیا۔ عدل و قسط کی تاکید کی تو دوست و دشمن کی تمیز و امتیاز کے بغیر عدل و انصاف کر کے دکھایا۔ عفو و صفح کی نصیحت کی تو اپنے جان کے دشمنوں، اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا۔ جو دعوت دی اس کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو گویا لوگوں پر قولاً اور عملاً آخری درجہ میں حجت

قائم ہو گئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

یہی مضمون سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء و رُسل کی اس مقدّس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک امتیازی شان ہے۔ پہلے بھی رسول بشیر و نذیر بن کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تکرار کے ساتھ آیا ہے : وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا.... وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا.... اور وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ○ "قومِ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا.... قومِ ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا.... اور ہم نے مدین (میں رہنے والی قوم) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا....." چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل نبوت اور رسالت کا معاملہ علاقائی یا قومی ہوتا تھا' لیکن جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام و اتمام ہوا اور رسالت کی تکمیل ہوئی' اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ حضور ﷺ سارے جہان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید' فرقان حمید اسی مقصد کے لئے نازل فرمایا گیا :

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ○ ﴾

یہی بات سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی : ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ ﴾ اور سورۂ سبا میں حضور ﷺ کی آفاقی و عالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا :

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ﴾

"اور (اے نبیؐ) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!"

لیکن یہ بات جان لیجئے کہ رسول ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان' دلیل اور بیّنہ بن کر تشریف لاتے ہیں' لہٰذا جہاں رسولوں کی بعثت رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ' ہمیں معلوم نہیں تھا' ہم جانتے نہیں تھے کہ تیری رضا کیا ہے۔ لیکن رسولوں کے آنے کے بعد یہ عذر ختم ہو گیا۔ اب

محاسبہ شدید ہو گا اور پکڑ سخت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار اُن قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا' اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا' ان کی تکذیب کی' ان کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور اُن چند لوگوں کو جو ان رسولوں پر ایمان لائے تھے بچالیا' اور اُن قوموں کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنبیہہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں' تبلیغ کر رہے ہیں' تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں' ایک ایک گھر پر جا کر پیغام ربانی پہنچا رہے ہیں' ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے رب کو تمہاری کوئی پروا ہے۔ اللہ کو ہرگز تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر تمہیں پکارنا اور خبردار کرنا مقصود نہ ہوتا تو ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ اس لئے کہ سنّت اللہ یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اُسے متنبّہ اور خبردار کر دیا جائے' جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا :

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ ﴾

"ہم عذاب نہیں بھیجتے رہے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرما دیں۔"

یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمامِ حجت نہ ہو جائے' اس سے پہلے قومیں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لہٰذا یہاں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے رب کا پیغام پہنچا دیا' تمہارے سامنے تمہارے رب کی دعوت پیش کر دی۔ مجھ تک جو ہدایت ربانی آئی تھی' اسے قولاً اور عملاً تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ یہ تمہارے ہی نفع کے لئے کیا گیا ہے' ورنہ میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے ﴿مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ﴾ یہ تبلیغ و دعوت اس لئے ہے کہ تم کو خبردار کر دیا جائے۔ اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا ﴿لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ﴾ تو رُشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی ـــــ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ "پس تم جھٹلا چکے' تم تکذیب کر چکے"۔ عربی زبان میں فعل ماضی پر جب "قَدْ" کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں Present Perfect Tense کا جو مفہوم ہوتا ہے' یعنی کام ہو چکا ہے' بات ہو چکی ہے' یہی مفہوم عربی میں فعل ماضی پر "قَدْ" کا اضافہ

کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ سو لوگو، تم جھٹلا چکے ہو۔ اب عنقریب اس کی پکڑ آ کے رہے گی ﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۝﴾ لازم و ملزوم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ لِزَامًا کے معنی ہوں گے جسے کوئی چیز چمٹ کر رہ جائے، چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا : ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۝﴾ "سو تم نے (دعوتِ ربانی کو) جھٹلا دیا، پس عنقریب اس کا وبال تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔" تمہیں اس تکذیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیتِ مبارکہ نہ صرف اُن لوگوں کے لئے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس خلقِ خدا کو دعوت پہنچا رہے تھے بلکہ ہمارے لئے بھی بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا جو اختتام و اتمام ہوا ہے، رسالت کی جو تکمیل ہوئی ہے، اس کا ایک مظہر وہ ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کے لئے ہے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ ہی کا دورِ رسالت تا قیام قیامت جاری ہے۔ یہ دَور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، یہ بھی دورِ رسالتِ محمدی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ ہر انسان جو آج دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہو گا وہ نبی آخر الزماں ﷺ کی امّتِ دعوت میں شامل ہے۔ ہاں اُمّتِ اجابت میں وہی شامل ہو گا جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہے، حضورؐ کی تصدیق کرے، حضورؐ پر ایمان لائے۔ لیکن امتِ دعوت سے مُراد وہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام کی امت دعوت قوم عاد تھی، حضرت صالح علیہ السلام کی اُمت دعوت قوم ثمود تھی، اسی طرح جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت پوری نوع انسانی ہے۔ اور پیغامِ ربانی کو جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بنفس نفیس اُن لوگوں کو پہنچایا جو آپؐ کے مخاطبینِ اولین تھے، اسی طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر بسنے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔ حضورؐ نے تکلیفیں جھیل کر اور مصیبتیں اٹھا کر یہ فریضۂ دعوت انجام دیا۔ آپؐ کا تمسخر و استہزاء بھی ہوا، آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا، آپؐ کے راستہ میں کانٹے بھی بچھائے گئے، آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ چشم ہائے

مبارک اُبل پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شانۂ مبارک پر' جبکہ آپؐ سربسجود تھے' اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں میں آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جسد اطہر لہولہان ہو گیا اور جسم سے خون اقدس بہہ بہہ کر نعلین شریف میں جم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپ ﷺ نے جھیلیں' لیکن دین کا پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دی۔

اب یہ کام اُمّتِ مسلمہ کے ذمہ ہے' میرے اور آپ کے ذمہ ہے' حضور ﷺ کے ہر اُمتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بریٔ الذمہ ہو جائیں گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو رد کریں اور اُس کو قبول کرنے سے انکار کریں تو پھر وہ ذمہ دار ہوں گے' سارا بوجھ ان پر آئے گا۔ لیکن اگر معاملہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم اس بات کے محتاج ہو گئے ہیں کہ قرآن ہمیں پہنچایا جائے تو مجرم ہم ٹھہریں گے۔ سو معلوم ہوا کہ ہمارے شانوں پر دوہری ذمہ داری آ گئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا اگر ان تک پیغام نہیں پہنچ رہا' انذار نہیں ہو رہا' دعوتِ ربانی کا حق ادا نہیں ہو رہا' تو ان لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا وبال بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا ہیں' لیکن اِلّا ماشاء اللہ' ہم عملاً تو تکذیب کر رہے ہیں۔ ایک تکذیب قولی ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے' جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب نے حضور ﷺ کی تکذیب کی ـــــ جبکہ ایک تکذیب عملی ہوتی ہے کہ بظاہر زبان سے حضورؐ کو نبی اور رسول مان لیا جائے' لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تکذیبِ عملی کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ الجمعہ میں آئی ہے :

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

"مثال ان کی جو حامل تورات بنائے گئے تھے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری کو

ادا نہ کیا' اُس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو' اور بہت بری ہے مثال اُس قوم کی جس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

اب آپ اِس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمایئے : ﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تکذیب کون سی ہے! ـــــ یہ تکذیب درحقیقت تکذیبِ عملی ہے کہ تورات کے کتاب اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہر بات ہے کہ تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر اُس کے اَحکام پر کاربند نہیں ہیں' اگر تورات کے نواہی سے اجتناب نہیں کیا جا رہا' جو ذمہ داریاں تورات نے عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پہلوتہی کی جا رہی ہے' اُن سے اغماض برتا جا رہا ہے تو چاہے زبان سے یہود اقرار کرتے ہوں کہ وہ تورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ رویہ تورات کی تکذیب کے مترادف ہے۔ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ بعینہٖ یہی معاملہ ہمارا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں پہلے ہی سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے جس کا آغاز "یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ" کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی "اے قرآن والو!" جیسے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے "یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ" کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے' محبوبِ ربّ العالمین ﷺ ہم مسلمانوں سے خطاب فرما رہے ہیں "یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ" کے الفاظ سے ـــــ ارشاد ہوتا ہے : ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) "اے قرآن والو! قرآن حکیم کو اپنا تکیہ نہ بنا لینا"۔ اُسے ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا ۔ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے' ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے : ((وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ)) "اُسے پڑھو جیسا کہ اُس کے پڑھنے کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ ((وَاَفْشُوْهُ)) "اسے پھیلاؤ" اُسے عام کرو' اس کی تبلیغ کرو' اس کے نور سے چار دانگِ عالم کو منور کرو۔ ((وَتَغَنَّوْهُ)) "اور اُسے خوش الحانی سے پڑھو" کہ اس سے تمہاری روح کو غذا میسر

آئے۔((وَ تَدَبَّرُوا فِیْہِ)) "اور اس میں تدبّر کرو' غور و فکر کرو"۔ وہی بات جو ہم نے اس رکوع میں پڑھی کہ ﴿ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ○ ﴾ چنانچہ قرآن پر تدبر ہو' غور و فکر ہو۔ آخر میں ارشاد فرمایا : ((لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) "تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے ہم مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے' لیکن حقیقتاً ہم تکذیب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہی عملی تکذیب ہے۔ اس معنی میں اس آیت مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں : ﴿ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ ﴾ اے نبیؐ ! ان لوگوں کے کان کھول دیجئے' انہیں یہ بات سنا دیجئے کہ میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے' بلکہ اُس نے اگر مجھے مبعوث فرمایا ہے' مجھ پر یہ قرآن نازل فرمایا ہے تو صرف اس لئے کہ تم پر اتمامِ حجت کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا میں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر حجت قائم کر دی ہے۔ لیکن ﴿ فَقَدْ کَذَّبْتُمْ ﴾ تم جھٹلا چکے ہو' تم نے کفر کی روش اختیار کی ہے ـــــ خواہ یہ جھٹلانا قولاً ہو یا عملاً ہو ـــــ ﴿ فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا ﴾ پس جان رکھو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چمٹ کر رہے گی۔ اس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے۔

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ
وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ ○○

اہم اعلان

قرآن حکیم کے منتخب نصاب (مشتمل بر ۴۴ کیسٹ) کی دوبارہ مکمل' واضح اور ہائی فائی اسٹیریو ریکارڈنگ تیار کر لی گئی۔ یہ edited سیٹ مکتبہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرات دوبارہ ریکارڈنگ کرانا چاہتے ہیں وہ بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

علّامہ اقبال کے افکار و خیالات

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی نے یہ خطاب ۹ نومبر ۹۷ء کو کراچی میں یوم اقبال کی ایک تقریب میں فرمایا اور خطاب کا آغاز سورۃ الصف کی ان آیات سے کیا جن سے آپ بالعموم تحریک خلافت کے خطابات کا آغاز کرتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۹۱ء میں شہر کراچی ہی کے خالق دیناہال سے ہماری تحریک خلافت کا آغاز ہوا تھا' جہاں پر اس صدی کے آغاز میں ہندوستان میں اٹھنے والی تحریک خلافت کے زعماء پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا تھا اور انہیں سزائیں سنائی گئی تھیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کے احیاء میں علامہ اقبال کا حصہ سب سے زیادہ ہے لہٰذا ان آیات مبارکہ کا آج کے موضوع کے ساتھ گہرا ربط و تعلق ہے۔ (ادارہ)

پس منظر

سورۃ الصف آیت ۸ اور سورۃ التوبہ آیت ۳۲ میں اللہ تعالیٰ نے ایک پیش گوئی فرمائی ہے کہ یہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا۔ گویا ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

سورۃ التوبہ کی آیت میں یہ مضمون منفی انداز میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرمائے' اگرچہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔ اس طرح پہلی بات تو یہ یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن کی رو سے اللہ کے نور کا اتمام باقی ہے جو ہو کر رہے گا ع

نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

سورۃ الصف کی آیت ۹ اور سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳ ایک ہی جیسے الفاظ پر مشتمل ہیں :

﴿ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الھدیٰ (ہدایت کاملہ یعنی قرآن حکیم) اور دین برحق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین پر' چاہے یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔"

تو گویا اس آیت میں غلبہ دین حق ہو کر رہنے کا ذکر ہے۔

پھر سورۂ سبا آیت ۲۸ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ﴾

"اور (اے محمد ﷺ) نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام بنی نوع انسان کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر۔"

اب ان آیات کو جوڑیں تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کُل عالم انسانیت پر اللہ کے دین کا غلبہ ہو کر رہے گا' اور بعثت محمدیؐ کے مقصد کی تکمیل اُسی وقت ہو گی اور نورِ خداوندی کا اتمام بھی بتمام و کمال اسی وقت ہو گا۔ اس کے لئے قرآن حکیم میں کوئی ٹائم ٹیبل تو نہیں دیا گیا' البتہ اس کا وقوع پذیر ہونا اٹل اور قطعی ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ احادیث شریفہ میں بھی اس کی وضاحت آئی ہے۔ ایک حدیث جو ہم تحریک خلافت کے آغاز سے ہی شائع کر رہے ہیں اُس میں حضور ﷺ نے دَورِ نبویؐ سے لے کر قیام قیامت تک پانچ دَور گنوائے ہیں۔ پہلا دَورِ نبوت' پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' پھر ظالم ملوکیت' پھر مجبوری والی ملوکیت اور پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ۔ یعنی دَورِ نبوت کے بعد بھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور اور پھر قیامت سے متصلاً قبل بھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور۔ پس اب جب خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا غلبہ ہو گا تو وہ عالمگیر ہو گا۔

اسی طرح حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مسلم شریف میں ایک روایت ہے جو صحت کے اعتبار سے انتہائی بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا' وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُهَا مَا زُوِیَ لِی مِنْهَا))

"بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین کو میرے لئے لپیٹ دیا۔ چنانچہ میں نے پوری زمین کے مشرق و مغرب دیکھ لئے اور یقیناً میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو سکیڑ کر مجھے دکھائے گئے"۔

اِسی طرح ایک اور حدیث میں اس طرح الفاظ آئے ہیں کہ روئے ارضی پر نہ کوئی خیمہ رہے گا اور نہ کوئی گھر رہے گا جس میں اللہ کا دین داخل نہ ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر کے رہے گا' دو میں سے ایک صورت میں' یا تو گھر والا' یا خیمے والا اسلام لے آئے گا تو اس کے گھر میں اسلام داخل ہو گا اس کے اپنے اعزاز کے ساتھ' یا اگر وہ اسلام نہیں لائے گا تو پھر اسے نیچے ہو کر رہنا پڑے گا اور اسلام کی بالادستی قبول کرنی پڑے گی۔ تو گویا اُس کے گھر میں اسلام تو داخل ہو جائے گا اگرچہ وہ محروم رہے گا۔ اس اعزاز سے اس بدنصیب کو کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

مندرجہ بالا قرآنی تصریحات اور احادیث نبویؐ کے مطابق میری یہ رائے ہے کہ وہ دَور اب زیادہ دُور نہیں بلکہ بہت قریب ہے۔ اگرچہ فوری طور پر اس سے پہلے اُمتِ مسلمہ کو کچھ سزائیں ملنی ہیں جن کی خبریں احادیث نبویہؐ میں دی گئی ہیں۔ لیکن یہ دَور بھی عارضی ہو گا اور پھر اس کے بعد غلبے کا دَور زیادہ دور نہیں۔ میں تو یہ رائے قرآن و حدیث کی روشنی میں پہلے سے قائم کر چکا تھا' اب حال ہی میں الازہر یونیورسٹی کے ایک معتبر شیخ اور محدث امین محمد جمال الدین کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے' جس کا نام ہے "عمر اُمة الاسلام" یعنی اُمت مسلمہ کی عمر کتنی ہے۔ اس کا ترجمہ بھی "میثاق" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ یہ پندرھویں صدی آخری صدی ہے' اس میں غلبہ اسلام کا دَور آنا ہے اور اس دَور سے پہلے کچھ سزاؤں کا دَور بھی آنا ہے۔ مصری شیخ کی رائے پر غور کریں تو مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث ذہن میں آتی ہے جس کے راوی یکے از عشرہ مبشرہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ بڑی فضیلت والے صحابی ہیں' فاتح ایران ہیں' ایران کے گورنر بھی رہے۔ ایک بڑی ہی پیاری نسبت ان کو حضور ﷺ

کے ساتھ یہ ہے کہ جب غزوۂ احد کے موقع پر کفار گھیراؤ کر کے حضورؐ پر تیر برسا رہے تھے تو یہی حضرت سعدؓ حضور ﷺ کے دفاع میں کفار پر تیر پھینک رہے تھے۔ اُس وقت آپؐ نے یہ الفاظ کہے : "اے سعد تیر چلاتے رہو تم پر میرے ماں باپ قربان۔" میری دانست کی حد تک آپؐ نے یہ الفاظ کسی اور صحابی کے لئے نہیں کہے۔ یہی سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "میں نہیں سمجھتا کہ میری اُمت اپنے رب کے نزدیک اتنی عاجز ہو جائے گی کہ وہ اسے نصف یوم کی مہلت بھی نہ دے"۔ اس پر لوگوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس یوم سے کیا مُراد ہے۔ انہوں نے جواب دیا "پانچ سو برس"۔ اگرچہ یہ جواب حضور ﷺ کا نہیں بلکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا ہے لیکن غور کیجئے جس طرح ہمارے قمری، شمسی اور دیگر کئی کیلنڈر ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بھی ایک کیلنڈر ہے جس کا ایک دن ہمارے مطابق ایک ہزار برس کا ہوتا ہے، اور یہ بات قرآن پاک میں دیگر اہم باتوں کی طرح دو دفعہ آئی ہے۔ ایک تو سورۃ الحج میں ﴿ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ﴾ "آپ کے رب کے نزدیک ایک دن آپ کے حساب سے ہزار برس کا ہے"۔ پھر مزید زور دار الفاظ سورۃ السجدہ میں آئے ہیں۔ یہ سورۃ السجدہ آپؐ کو بہت عزیز اور محبوب تھی۔ جمعہ کے روز فجر کی نماز میں آپؐ پہلی رکعت میں سورۃ السجدہ پڑھتے تھے۔ اس میں آتا ہے ﴿ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہوتی ہے آسمان سے زمین کی طرف۔ پھر وہ (معاملات) لوٹتے ہیں اللہ کی طرف اور یہ ہوتی ہے ایک دن میں جو کہ تمہارے حساب سے ہزار برس ہے۔ اس طرح نصف دن پانچ سو برس کا ہوا۔

تاریخی اعتبار سے اُمت مسلمہ کی عمر کے ایک ہزار برس پورے ہوئے تو ارض پاک و ہند میں ایک بہت بڑا فتنہ اُٹھا، یعنی دین اکبری کا فتنہ۔ حقیقت میں یہ فتنہ دو بڑے علماء ابوالفضل اور فیضی کا اُٹھایا ہوا تھا۔ یہ دونوں اکبر کے مصاحبان خاص تھے اور نورتنوں میں شامل تھے۔ خود اکبر تو اَن پڑھ اور جاہل مطلق تھا۔ درباری علماء نے اسے یہ بات سجھائی کہ محمد ﷺ کا دین صرف ایک ہزار برس کے لئے تھا، وہ تو اب ختم ہوا، اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے، اور یہ ہے دین اکبری یا دین الٰہی۔ دین الٰہی کی حقیقت کیا تھی؟ یہ کہ

تمام مذاہب میں خدا کا تصور تو موجود ہے۔ بدترین مشرکانہ مذاہب بھی ایک Supreme Being کو مانتے ہیں۔ ہزاروں بتوں' دیوی' دیوتاؤں (gods) کو پوجنے والے بھی ایک خدا (God) کو مانتے ہیں جسے وہ مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ اُسے Omnipresent' Almighty' Omnipotent مانتے ہیں۔ ان کے ہاں "الٰہ" تو بہت ہیں مگر اللہ ایک ہی ہے۔ گویا خدا تمام مذاہب کے ہاں قدرِ مشترک ہے۔ سارا جھگڑا تو نبوت کے تصور سے اٹھتا ہے۔ کسی کے ہاں موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و شریعت ہے' کسی کے ہاں عیسیٰؑ کی' کسی کے ہاں اور کسی کی۔ مسلمانوں کے ہاں نبوت و شریعت محمد ﷺ کی ہے۔ اگر درمیان میں سے نبوت کو نکال دیں تو اللہ یا مہادیو یا ہستی مطلق پر سب لوگ جمع ہو جائیں گے اور اختلاف ختم ہو جائے گا۔ یہ تھی اس فتنے کی بنیاد جو دوسرے ہزار سال کے آغاز میں برعظیم میں پیدا ہوا۔

ظاہر ہے کہ شریعت' اُمت اور اُمت کا تشخص تو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے قائم ہے۔ اگر رسالت کو درمیان سے نکال دیا جائے تو اُمت مرحومہ کا تشخص خود بخود محو ہو جائے گا۔ اکبر اعظم اگرچہ اَن پڑھ تھا مگر ذہین تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ ہندوستان میں مذاہب کی کھچڑی پکی ہوئی ہے۔ اگر اس کو حلیم میں تبدیل کر لیا جائے تو ہر شے کی اصلیت ختم ہو کر ایک نئی چیز وجود میں آجائے گی۔ اسلام گوشت ہو گا' باقی مذاہب دالیں۔ جو مذاہب کے آپس کے اختلافات ہیں اُن کو گھوٹ کر ختم کر دیا جائے تو نہ کہیں گوشت نظر آئے گا نہ دوسری دالیں' وہ سب یک جان ہو جائیں گی۔ اختلاف ختم' فساد ختم اور ہندوستان ایک بہت بڑی متحدہ قوت بن جائے گا۔ یہ اُس کے ذہن کا ایک بہت بلند سیاسی فکر تھا۔ اسے دین اکبری اسی لئے کہا گیا کہ اکبر نے اس کا فلسفہ پیش کیا' اگرچہ یہ ساری پٹی ابوالفضل اور فیضی کی پڑھائی ہوئی تھی۔

دوسری طرف سے یہی فتنہ تصوف کے راستے سے آرہا تھا۔ تصوف میں ہمہ اوست کا تصور آیا کہ وہ تو ایک ہی ہے' صرف ایک۔ باقی سب اسی ایک کا ظہور ہے' بس وہی موجود ہے اور کچھ نہیں۔ اس طرح اُمت کا جداگانہ تشخص ختم ہو رہا تھا۔ کہتے تھے رام اور رحمٰن میں کوئی فرق نہیں۔ "مسجد مندر بِکڑو نور"۔ یہ دو فتنے بیک وقت اٹھے' ایک

تصوف کا فتنہ دوسرا سیاسی فتنہ۔ دونوں کا ہدف دین محمدیؐ کو ختم کرنا تھا۔

یہاں اسلام کا مدوجزر ملاحظہ ہو۔ یہ وقت برعظیم میں دین اسلام پر انتہائی زوال کا وقت ہے مگر سیاسی اعتبار سے یہاں مسلمان عروج پر تھے۔ اکبر اعظم کی سلطنت وسعت کے اعتبار سے اپنی انتہا پر تھی' جبکہ اسلام کے زوال کی انتہا بھی عہد اکبری میں ہوئی۔ یہ بات مسلم ہے کہ ہر جزر کے بعد مد ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ وقت بھی ہے جہاں سے اسلام کے ارتقاء' احیاء (revival) اور اس کی نشاۃ ثانیہ (renaissance) کا آغاز ہوا۔ اس ارتقائی عمل میں علامہ اقبال کا بہت اہم مقام ہے۔

ختم نبوت کی حکمت

حضور ﷺ پر نبوت ختم ہو گئی' اب قیامت تک کسی شخص کو نبوت نہ ملے گی۔ لیکن یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ نبوت تو بہت بڑی رحمت اور نعمت ہے۔ اگر یہ ختم ہو گئی تو اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے بھی کچھ چیزیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ جان لیجئے کہ اس خلاء کو رب العزت نے تین چیزوں سے پُر کیا ہے :

(۱) قرآن کریم۔ یہ ہدایت کاملہ کے طور پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔ یہ کبھی ضائع ہو گا' نہ اس میں تحریف ہو گی۔ ہر طالب ہدایت اور ہر طالب حقیقت کے لئے ہر وقت اور ہر زمانے میں قرآن موجود رہے گا' کہ وہ اسے پڑھے اور ہدایت حاصل کرے۔

(۲) ہر صدی میں اللہ تعالیٰ ایسے مجدد اٹھاتا رہے گا جو دین کو تازہ کرتے رہیں گے۔ سنن ابی داؤد کی روایت ہے :

((اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ فِي هٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ عَامٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا))

"اللہ تعالیٰ اِس اُمت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا جو اس اُمت کی خاطر دین کو تازہ کریں۔"

۳) حق پرست لوگوں کا ایک گروہ ہر وقت اُمت میں موجود رہے گا۔ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا :

((لَا تَزَالُ فِی اُمَّتِی طَائِفَةٌ قَائِمِیْنَ عَلَی الْحَقِّ))

"میری اُمت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔"

پس قرآن کی محفوظیت' سو برس کے فاصلے پر صاحب عزیمت اور صاحب ہمت شخصیات جو دین کی صحیح صحیح تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کریں' اور ایک حق پرست گروہ کا ہمہ وقت موجود رہنا' یہ تینوں چیزیں مل کر اُس خلا کو پُر کریں گی جو سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ پہلے ایک ہزار سال میں یہ مجدد دین اُمت عالم عرب ہی میں پیدا ہوئے' جہاں حضور ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ پہلی صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیزؒ' دوسری صدی کے امام ابو حنیفہ' پھر امام شافعی' امام احمد بن حنبل' شیخ عبدالقادر جیلانی' امام غزالی' امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ یہ سب لوگ عرب میں پیدا ہوئے ہیں۔

پہلا ہزار سال ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز مقدر ہے۔ یہاں ایک دور ختم ہوا۔ دین محمدیؐ تو نہ ختم ہوا نہ ہو گا۔ آپؐ آخری نبی ہیں۔ دین تو قیامت تک رہے گا۔ البتہ مشیت الٰہی سے جس مقام کو دین اسلام کے اعتبار سے مرکزیت حاصل تھی وہ مقام تبدیل ہو گیا۔ اب اسلام کا مرکز ثقل (centre of gravity) عالم عرب اور مشرق وسطیٰ سے بدل کر جنوبی ایشیا میں برعظیم پاک و ہند میں منتقل ہو گیا۔ یہاں پھر اللہ کی مشیت دیکھئے۔ تمام تر احیائی عمل بھی یہیں شروع ہوا اور اب زوال کی بھی یہیں انتہا ہو رہی ہے۔ دیکھئے نیوٹن کا تیسرا قانون حرکت (For every action there is equal and opposite reaction) تو گیارھویں صدی کے مجدد ہیں شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ جنہوں نے ہمہ اوستی تصوف کا رُخ تبدیل کر کے اسے وحدت الوجود کی بجائے وحدت الشہود کی شکل دی اور سنت رسول ﷺ کی پیروی کی اہمیت کو واضح کیا۔ سیاسی اعتبار سے بھی حالات کو صحیح رخ پر موڑنے کی کوشش کی۔ وہ جاگیرداری کا دور تھا' کوئی پنج ہزاری منصب دار تھا' کوئی دس ہزاری اور کوئی بیس ہزاری۔ آپ نے ان سے رابطے کئے۔ وہ دور عوامی جدوجہد کا دور تو تھا نہیں کہ احتجاجی جلسے اور جلوس منعقد کئے جائیں۔ وہ تو دورِ ملوکیت تھا۔ آپ نے حالات کا بغور مطالعہ کیا اور حسن تدبیر سے تخت

اقتدار کے پایوں تک رسائی حاصل کرلی اور دین اکبری کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ دین اکبری جس کو پوری شہنشاہی قوت اور بڑے بڑے درباری علماء کے ذریعے رائج کرنے کی کوشش کی گئی تھی' اِس مردِ درویش نے اُس دین اکبری کا وہ جنازہ نکالا کہ آج اُس کا کوئی نام لیوا بھی موجود نہیں ہے۔ آپ نے مسلمانوں کا علیٰحدہ تشخص واضح کیا اور توحید باری تعالیٰ کے ساتھ رسالت پر ایمان لانے اور اسوۂ رسولؐ کو نشان منزل بنا کر جدوجہد کرنے کی اہمیت کو مسلمانوں کے اندر بحال کیا۔ یہ ہے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا کارنامہ۔

اس کے بعد آتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ' انہوں نے قرآن پاک کی اصل تعلیمات کو عام کرنے کے لئے کلام پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ قرآن مجید ایک بند کتاب کی صورت طاقوں میں سجا کر رکھا جاتا تھا۔ اس کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کی طرف کوئی دھیان نہ تھا۔ عام زبان فارسی تھی' عربی سے لوگ واقف نہ تھے۔ عربی یہاں پہلے پہل اُس وقت آئی تھی جب سندھ کے راستے محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ برعظیم میں داخل ہوئے۔ مگر وہ دور جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اسلام ماوراء النہر سے آیا اور فارسی زبان ساتھ لایا۔ فارسی زبان پھر یہاں کی سرکاری زبان ہو گئی' جس طرح ہندوستان میں برطانوی تسلط کے دوران انگریزی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ عربی سے نابلد ہونے کے باعث لوگ علوم قرآن سے ناآشنا تھے۔ عام روش یہی تھی کہ قرآن پڑھو' ثواب حاصل کرو' یا پھر ایصال ثواب کرو۔ اسے احترام کے ساتھ گرد پوش میں لپیٹ کر اونچی جگہ پر رکھو' اس کی طرف پشت نہ کرو اور بس۔ اس کے سوا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ حتیٰ کہ دینی مدارس میں بھی سارا زور تدریس و ترویج فقہ پر تھا۔ اس لئے کہ اگر کسی کو سرکاری عہدے دار قاضی یا مفتی بننا ہے تو اسے فقہ آنی چاہئے۔ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ قرآن پاک میں صرف آدھے پارے کی مقدار فقہی مسائل و احکام سے متعلق ہے' یعنی کل کتاب کا ۶۰/۱ حصہ۔ باقی پورے قرآن کا فقہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ تو اس طرح فقہ پر زور ہوا تو قرآن سے دلچسپی ختم ہوئی۔ البتہ مدارس میں عربی پڑھائی جاتی تھی' مولویوں اور عالموں کو عربی آتی تھی' لیکن ان کی دلچسپی بھی قرآن سے

نہیں ہوتی تھی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کو تاریخ کے ساتھ گہری مناسبت تھی' اُن کا تاریخ کا مطالعہ عمیق تھا۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ جہاں کے زمانے میں انگریزوں کی ہندوستان میں آمدورفت شروع ہوئی۔ شاہ جہاں بیمار ہوگیا تھا' اس کو بواسیر کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا' اور نامور جراح اور اطبّاء کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا تھا۔ مرض سخت تکلیف دہ تھی۔ شہنشاہ تخت پر نہ بیٹھ سکتا تھا کہ انداز شاہی اختیار کرے۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے شہنشاہ کا علاج کیا اور خدا کا کرنا کہ شاہجہاں ٹھیک ہوگیا۔ اندازہ کیجئے کہ انداز شاہی سے ڈاکٹر کو اس طرح نوازا گیا کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ اُس نے انگریزوں کے لئے حقوق تجارت مانگے کہ یہاں پکی کوٹھیاں اور کاروباری مراکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ اجازت مل گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر قابض ہوگئی۔ انگریز تاجروں کے ساتھ عیسائی مبلغین' مبشرین اور پادری بھی آگئے اور اسلام اور عیسائیت کے متعلق کچھ اختلافات کی باتیں ہونے لگیں۔ بالآخر شاہجہاں کے دربار میں مناظرہ ہوا۔ اندازہ کیجئے کہ کس پایہ کے علماء وہاں جمع ہوئے ہوں گے۔ کسی عام مولوی کی تو دربار میں رسائی ہی ممکن نہیں۔ مناظرہ شروع ہوا تو ان بڑے بڑے درباری علماء کے سامنے ایک انگریز پادری نے ایک آیت پڑھی کہ یہ قرآن میں ہے۔ سب علماء نے کہا نہیں نہیں یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں۔ اس نے کہا قرآن منگواؤ۔ قرآن لایا گیا' کھول کر دیکھا تو یہ آیت موجود تھی۔ اُس دَور میں قرآن سے دُوری کا یہ حال تھا۔ یہ عوام اور جہلاء کی بات نہیں' یہ علماء کی بات ہے' بڑے بڑے علماء بلکہ درباری علماء۔ پس شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا اصل کارنامہ قرآن کو کھولنا ہے۔ آپ نے قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ علماء نے ان کے خلاف فتویٰ دیا اور انہیں اس جرأت پر واجب القتل قرار دیا۔ فتح پور سیکری میں عصر کی نماز کے بعد اُن کا درس ہوتا تھا۔ چند افغان بلائے گئے جنہیں اُس وقت ولائتی کہتے تھے۔ یہ شاہ صاحب کو قتل کرنے پر مامور ہوئے۔ درس کے بعد جب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے دروازے سے باہر نکلے تو وہ لوگ آپ پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں شاہ صاحب کی ہیبت طاری کردی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے

آپ کو بچالیا۔ بعد ازاں آپ کے دو بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہما اللہ نے قرآن کے اردو ترجمے کئے جو مستند ترین ہیں۔ پھر شاہ عبدالقادر کے انتہائی مختصر مگر جامع حواشی "موضح القرآن" کے نام سے موجود ہیں۔ جو بات انہوں نے لکھی ہے بے حد ثقہ اور معتبر ہے۔ تیسرے بیٹے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تفسیر لکھی اور اس طرح علوم قرآن کی ترویج و اشاعت کا آغاز کیا۔

ہندوستان میں تجدیدی کام کے سلسلہ میں پہلا قدم مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کا ہے جنہوں نے اُمت مسلمہ کا جداگانہ تشخص مشہود کیا۔ سنّتِ رسول ﷺ اور اطاعت رسول ﷺ پر زور دے کر تصوف کے راستے سے آنے والے باطل نظریات کا رد کیا اور دین اکبری کا جنازہ نکال دیا۔ پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بند قرآن کو کھولا' رجوع الی القرآن کی دعوت دی' قرآن پاک کا ترجمہ کر کے اسے لوگوں کے لئے قابل فہم بنایا۔ آپ نے ایک چھوٹا سا رسالہ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" لکھا تاکہ عام آدمی بھی سمجھ لے کہ قرآن کی تفسیر کے کیا اصول ہیں۔ آپ نے اس نظریئے کا ابطال کیا کہ قرآن سمجھنا انتہائی مشکل اور نازک کام ہے اور جب تک سو طرح کے علوم حاصل نہ کئے جائیں قرآن کو کھولا نہیں جا سکتا۔ الفوز الکبیر چھوٹا سا رسالہ ہے' اسے سمجھ کر پڑھ لو' پھر خود ہی قرآن پاک پر غور و فکر کرو' سوچ و بچار کرو' اس کو سمجھو' یہ تمہارے لئے کھلی کتاب ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اب آیئے تیرھویں صدی ہجری میں۔ یہاں سید احمد بریلوی رحمہ اللہ اُسی خانوادۂ ولی اللہی کے تربیت یافتہ' شاہ عبدالعزیزؒ کے مریدین میں سے ہیں اور شاگرد بھی۔ حصول علم میں بہت آگے نہیں گئے' اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی اور کام کے لئے پیدا کیا تھا ع ہر کسے را بہرِ کارے ساختند۔ ان کی طبیعت جلالی تھی۔ وہ جہاد کی طرف مائل تھے۔ ہندوستان دارالاسلام تھا' مسلمانوں کا ملک تھا' مگر اب ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ ایک طرف سکھوں نے حکومتیں بنا رکھی تھیں' ایک طرف مرہٹوں کی حکومتیں تھیں اور اُدھر سے انگریز مسلمان حکومتیں چھینتا چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ بنگال مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکا تھا' بہار بھی جا چکا تھا' سید صاحب ان طوفانوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ جہاد کا راستہ اپنا کر بر عظیم پر مسلمانوں

کی حکومت دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی سکیم کا آغاز کرنے کے لئے شمال مغربی سرحدی صوبہ منتخب کیا کیونکہ وہ عالم اسلام سے متصل ہے۔ اگر کسی اور طرف سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے تو کسی طرف سے کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بریلی سے چلے جو لکھنؤ سے بھی ۴۷ میل آگے مشرق کی طرف ہے۔ پھر پورا وسطی ہند عبور کرکے راجپوتانہ کراس کیا' اور سندھ سے گزر کر افغانستان پہنچے۔ پھر وہاں اوپر سے سرحد کے علاقے میں آئے۔ اس لئے کہ پنجاب کے راستے سے آنا ممکن نہ تھا' یہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ آج کے پیر پگاڑا علی مردان شاہ کی اوپر کی پانچویں پشت کے اُس وقت کے پیر صاحب پگاڑا سے طے ہوا کہ جب سید صاحب جہاد کرتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبے سے گزر کر پنجاب کی طرف آئیں گے تو پیر صاحب حُروں کی فوج لے کر بلوچستان سے گزرتے ہوئے ڈیرہ غازی خان میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ مل جائیں گے۔ پھر سکھوں کی حکومت کا خاتمہ کرکے انگریزوں کو ملک سے نکالیں گے اور دار الاسلام کو reclaim کریں گے۔ مگر یہ جدوجہد ناکام ہو گئی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ انگریزوں کے پاس جدید ہتھیار اور نئی ٹریننگ تھی۔ رنجیت سنگھ کی فوجوں کی تربیت فرانسیسی جرنیل نے کی تھی۔ مزید یہ کہ سرحد کے علماء نے مثبت کے بجائے منفی کردار ادا کیا۔

سنہری زنجیر (سلسلة الذهب) کے اس سلسلہ کی آخری کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا بھی وہی پروگرام تھا یعنی برعظیم سے انگریزوں کو نکالنے کا۔ چنانچہ ریشمی رومال کی تحریک کا آغاز ہوا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا کہ اِدھر سے مدد آئے' خود حجاز گئے۔ سندھ اس تحریک کا بڑا مرکز تھا مگر افسوس اس صدی میں یہ تحریک بھی ناکام ہو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے' میں نے حضرت شیخ الہند کو مشورہ دیا تھا کہ حضرت زمانہ بدل گیا ہے' اب کوئی مدد آپ کو افغانستان سے ملے گی نہ ترکوں سے۔ اب تو ہندوستان ہی میں بیٹھ کر آپ کو عوامی تحریک چلانی پڑے گی' مگر شیخ الہند نے میرے مشورے پر توجہ نہ دی' بلکہ اپنے بعض ایسے ساتھیوں کا مشورہ مان لیا جنہوں نے دوسرا راستہ بتایا تھا۔ بہرحال شیخ الہند حجاز میں گرفتار کر لئے گئے۔ شریف

حسین والی مکہ نے آپ کو گرفتار کر کے انگریز کے حوالے کر دیا جنہوں نے آپ کو مالٹا پہنچا دیا۔ یہی حشر عبیداللہ سندھی کا ہونے والا تھا مگر وہ جوان آدمی تھے' سکھ سے مسلمان ہوئے تھے' لہٰذا جذبہ بھی بہت مضبوط تھا۔ انہوں نے بھاگ کر روس میں پناہ لی اور بچ گئے۔ گویا یہ سکیم بھی ناکام ہو گئی۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ پورے ہندوستان کا دار الاسلام بننے کا معاملہ تو ذور کی بات ہے' اب تو اس کے کسی ایک حصے کے اندر بھی ایسا امکان پیدا ہو جائے تو غنیمت ہے۔

۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ اقبال پیدا ہوئے۔ اُن کی پیدائش کو ۱۲۱ سال ہو گئے ہیں۔ علامہ اقبال نابغۂ روزگار تھے۔ طبع موزوں پائی تھی۔ شعر کہنے شروع کئے۔ ابتداء میں عشق و فراق اور وطن کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اُن کی فکر میں عظیم تغیر پیدا ہوا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک وہ انگلستان اور جرمنی میں رہے۔ یہ تین سال اُن کی زندگی میں انتہائی اہم ہیں۔ اس دوران انہوں نے مغرب کے حالات کا مشاہدہ کیا اور Current Philosophy کا مطالعہ کیا۔ یہاں جو اسلام کا حال ہو چکا تھا انہیں معلوم تھا' جسے حالی نے یوں بیان کیا تھا :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ابھی حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ اقبال کو وہاں کچھ روحانی تجربہ بھی ہوا۔ غیبی اشارات کے ذریعے انہیں وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص راہنمائی بھی ہوئی اور اقبال کی قلب ماہیت ہو گئی۔ چنانچہ اب وہ گل و بلبل کا شاعر نہیں رہا۔ جب گیا تھا تو گل و بلبل کا شاعر تھا' واپس آیا تو ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا ترجمان اور سب سے بڑا نقیب بن چکا تھا۔ یہاں بھی قانون قدرت کار فرما ہے۔ جب حالات انتہا پر پہنچتے ہیں تو ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ آج بھی کچھ لوگ ہیں جو یہاں دوڑ دھوپ کرتے کرتے مزید کی تلاش میں مغرب کا رخ کرتے ہیں تو وہاں پہنچ کر مغربی تہذیب کی چمک اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ

گویا گوہر مقصود حاصل کر کے وہاں کی بھاگ دوڑ میں شامل ہو کر اپنی مشرقیت ہی ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ وہاں گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے 'گندی نالی کا کیڑا بن گئے اور بزعم خویش وہاں adjust ہو گئے۔ مگر کچھ دوسرے لوگ ہیں کہ دیارِ مغرب میں پہنچ کر عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہاں کی روشنیوں سے بھی ضرور متاثر ہوتے ہیں مگر اُن کے خمیر میں مسلمان ماں باپ کی تربیت یا کسی ابتدائی تعلیم کے استاد کی تعلیم کے اثرات ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر وہ adjust نہیں کر پاتے بلکہ اُلٹا اُن کے ضمیر کی خفتہ چنگاری جو خاکستر کے نیچے دبی ہوئی تھی 'بھڑک اُٹھتی ہے اور وہ "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے" کے مصداق بن جاتے ہیں۔ یہی معاملہ اقبال کا تھا۔ چنانچہ اب اقبال اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نقیب بن کر پکارتا ہے ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا 'شجاعت کا' عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

اگرچہ اقبال اس وقت یہ کہہ رہا ہے لیکن خود مسلمانوں کی حالت بھی اُس سے اوجھل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان پر امید و بیم کی کیفیات آتی رہتی ہیں۔ کبھی حالات کا تاریک رُخ زیادہ نظر آنے لگتا ہے اور انسان پر مایوسی کے اندھیارے چھا جاتے ہیں 'کبھی حالات کا روشن پہلو سامنے آتا ہے تو ذہن میں ایک خوشگوار کرن پھوٹ پڑتی

ہے۔ فَلَعَلَّ شَعْشَعَةً تَلْمَعُ لَكَ شاید کہ تمہارے دل میں کوئی شعاع چمک اٹھے۔ چنانچہ اقبال کی ایک کیفیت تو اوپر بیان ہوئی۔ دوسری کیفیت میں اقبال ملت اسلامیہ کا حال اس طرح بیان کرتا ہے ؎

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است
ملت اندر خاکِ اُو آسودہ است

ہمارے سامنے ایک دقیانوسی، فرسودہ، پرانا اور بوسیدہ نظام ہے اور ملت اسلامیہ کا یہ حال ہے کہ وہ اس فرسودہ عالم میں خاک کے اندر مست پڑی ہوئی ہے۔ اسے احساس بھی نہیں کہ وہ مٹی میں مل چکی ہے ؎

رفت سوزِ سینہ و تاتار و کُرد
یا مسلماں مُرد یا قرآں بمُرد

تاتاریوں اور کردوں کے سینہ کی حرارت ختم ہوگئی۔ اُن کی اسلامی غیرت و حمیت قصۂ پارینہ ہوگئی۔ گویا قرآن مرگیا یا مسلمان مرگیا۔ کیونکہ قرآن تو سینے میں آگ لگادیتا ہے، جوش و جذبہ پیدا کرتا ہے۔ کیا ہوا کہ اب وہ آگ لگی ہوئی نظر نہیں آتی!

غور کیجئے یہاں تاتار و کرد کیوں کہا؟ اس لئے کہ امت مسلمہ کی قیادت کی ایک shifting ہو چکی تھی۔ اُمت مسلمہ کا پہلا عروج عربوں کی زیر قیادت ہوا۔ حضور ﷺ خود عرب، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرب، قرآن عربی میں، بنو اُمیہ اور بنو عباس بھی عرب تھے۔ پھر تاتاریوں کے ہاتھوں زوال آیا۔ کروڑوں قتل ہوئے، بنو عباس کا دور ختم ہوا۔ مگر اس کے بعد دوبارہ مسلمان ابھرے ـــــ اسلام نہیں ـــــ اسلام کا زوال خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوا تو پھر ہزار برس تک مسلسل زوال رہا ہے۔ ہاں مسلمان ایک مرتبہ پھر اُبھرے۔ لیکن اب قیادت عربوں کی نہیں، ترکوں کی ہے۔ یہ اُمت کے اندر قیادت کی تبدیلی ہے۔ یعنی وہی تاتاری جن کے ہاتھوں اُمت مسلمہ کو زوال آیا تھا اور وہ کروڑوں مسلمانوں کے قاتل تھے، اِنہی کی آئندہ نسل اسلام لے آئی۔ ترکانِ تیموری، ترکانِ سلجوقی، ترکانِ صفوی اور ترکانِ عثمانی سب کرد تھے۔ گویا عربوں کے زوال کے بعد یا تو کردوں نے اسلام کو قوت بخشی یا پھر تاتاری مسلمان ہوگئے اور امت کے قائد بن گئے ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

مگر اب اقبال پوری صورت حال دیکھ رہے تھے۔ عربوں کے سینے تو پہلے ہی خالی ہو گئے تھے۔ اب موجودہ لوگوں کی حالت بھی یہ ہے کہ ع اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک! یعنی اقبال کہتے ہیں کہ میں نے مدرسہ بھی دیکھ لیا خانقاہ بھی دیکھ لی' کہیں کچھ نہیں رہا۔ مدرسوں میں علم نہیں رہا' خانقاہوں میں روحانیت نہیں رہی۔ اس حقیقت کو مزید تلخ انداز میں اقبال بیان کرتے ہیں ؎

تیرے محیط میں کوئی گوہرِ زندگی نہیں
دیکھ چکا میں موج موج' ڈھونڈ چکا صدف صدف

یعنی میں نے ساری سیپیاں کھول کر دیکھ لیں' کہیں کوئی موتی نہیں۔ ہر موج کو تلاش کیا' لیکن تیرے محیط (Ocean) میں گوہرِ زندگی معدوم ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخ پر بھی نظر رکھئے۔ امت مسلمہ کے دوسرے ہزار سال میں مجددین اُمت کا سلسلہ برعظیم پاک و ہند میں چل رہا ہے۔ شیخ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ' سید احمد بریلوی اور چوتھی کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اب یہاں سے ایک نیا تجدیدی کام جزوی مجددین سے شروع ہوا ہے' جزوی اور تدریجی۔ یعنی اب ایسی جامع صفات شخصیات تو نہیں مل سکتیں جن میں علم قدیم بھی ہو علم جدید بھی' ذکر بھی ہو فکر بھی' جہاد بھی ہو تقویٰ بھی۔ یہ کل چھ اَبعاد (dimensions) ہیں۔ اگر یہ تمام صفات کسی ایک شخص میں تلاش کی جائیں تو مایوسی ہو گی' بددلی پیدا ہو گی اور کام رُک جائے گا۔ لہٰذا ہمیں اس بات پر قناعت کرنا ہو گی کہ کسی ایک شخص میں کوئی ایک چیز نظر آ جائے تو اسے دوڑ کر لے لیں۔ "خُذْ ما صَفا و دَعْ ما کَدِر" کے مصداق جو اچھی چیز ہے اسے لے لو' جو اس کے منافی ہے اسے چھوڑ دو۔ البتہ حضور ﷺ کی پیشین گوئی ہے کہ جس طرح میرے بعد خلافت راشدہ ہے' بالکل اس طرح کی خلافت ایک دفعہ پھر آنی ہے۔ گویا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تو تتمہ ہے دورِ نبوت کا۔ ۲۳ برس کی جدوجہد میں حضور ﷺ اور

صحابہ رضی اللہ عنہم نے انقلاب برپا کیا۔ کیا دوبارہ ایسا ہو سکتا ہے؟ بظاہر ناممکن ہے۔ تاریخ انسانی میں ایک ہی مرتبہ حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں ایسا ہوا ہے ـــــ نہ ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں' نہ اسماعیل کے ہاتھوں' نہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں۔ بس ایک ہی دفعہ ہوا ہے۔ مگر جب حضور الصادق المصدوق ﷺ نے بتایا ہے کہ ایک بار پھر ہونا ہے تو بلاشبہ ایسا ہو کر رہے گا' مگر یہ کام ۲۰ برس کی جدوجہد میں ہو جائے یہ ناممکن ہے۔ البتہ کئی نسلوں کی جدوجہد سے یہ کام تدریجاً انجام پائے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ تم اوپر اُٹھو گے مگر درجہ بدرجہ' سیڑھی بہ سیڑھی۔ ان حقائق کو مدنظر رکھیں تو دو نتائج نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ اب آپ اس طرح کا جامع مجدد تلاش نہ کیجئے جس میں چھ کی چھ صفات جمع ہوں۔ بلکہ پہلے بھی سارے کے سارے مجدد ایسے جامع صفات نہیں ہیں۔ خود شاہ ولی اللہؒ صاحب سیف تو نہیں تھے' صاحب قلم تھے' صاحب ذکر تھے' صاحب فکر تھے۔ علم قدیم بھی رکھتے تھے مگر جدید علم ابھی یہاں آیا ہی نہ تھا۔ اگرچہ انگریز آ چکا تھا۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۷۶۲ء میں ہوا مگر انگریز تو ۱۷۵۷ء میں بنگال میں آ چکا تھا' یعنی پانچ سال پہلے' مگر مغربی علوم برعظیم میں ابھی نہیں پہنچے تھے۔ تو گویا جدید علم شاہ صاحب کے پاس نہیں تھا۔ اس طرح اس سے قبل کے مجددین کا بھی یہی معاملہ تھا۔ ابن تیمیہؒ صاحب سیف اور صاحب قلم تھے مگر امام غزالیؒ تو ایسے نہ تھے۔ چودھویں صدی کے مجدد اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ ہیں جدید تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مغربی فلسفہ کیا ہے' مغربی عمرانیات' مغربی پولیٹیکل سائنس' مغربی اکنامکس' فزکس اور کیمسٹری کیا ہے۔ پس اب تو جزوی قسم ہی کے لوگوں کو سینے سے لگانا ہو گا۔ کسی کے پاس فکر صحیح ہے تو لے لو' کسی کے پاس علم قدیم ہے تو لے لو' کسی کے پاس جذبہ جہاد ہے تو لے لو۔ علیٰ ہذا القیاس۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ اب ذہناً تیار رہئے کہ اب یہ کام تدریجاً ہو گا' یہاں تک کہ وہ آخری منزل آ جائے گی۔ (جاری ہے)

رسولِ اکرم ﷺ مغربی اہل دانش کی نظر میں

تالیف، پروفیسر محمد شریف بقا

زیر نظر کتاب "رسول اکرم ﷺ مغربی اہل دانش کی نظر میں" میں پروفیسر شریف بقا نے مغرب کے بعض دانشوروں کے ایسے تاثرات اور اقوال جمع کر دیئے ہیں، جن کی روشنی میں مستشرقین کی تنگ نظری کے علی الرغم رسول اکرم ﷺ کی جاذب اور ہمہ گیر شخصیت اور ان کے پیغام کی افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فاضل مؤلف کو اس بات کا افسوس ہے کہ مخصوص سیاسی اور مذہبی پروپیگنڈے کی بنا پر، عرصۂ دراز سے یہودی اور عیسائی دانشور نہ صرف اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرتے چلے آئے ہیں بلکہ وہ حضور ﷺ کی شخصیت کی کردار کشی کی مذموم مہم میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ اس پر مستزاد المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے مغرب زدہ سکالرز (جو بزعم خود اپنے آپ کو "روشن خیال" کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں) بھی ضعیف اور غیر مستند روایات کا سہارا لے کر اسلام کو نشانۂ تضحیک بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان "دانشوروں" نے اگر اسلام کا مطالعہ تعصب کی عینک اتار کر کیا ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کا کبھی ارتکاب نہ کرتے۔

پروفیسر شریف بقا لکھتے ہیں کہ اکثر مستشرقین (Orientalists) اپنی لاعلمی کی بنا پر رحمۃ للعالمین ﷺ کو پیغمبر عرب قرار دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے ابدی پیغام کے پیش نظر، انہیں صرف عرب کی سرزمین تک محدود کر دینا ایک صریح زیادتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رحمۃ للعالمین ہونے کی حیثیت سے حضور ﷺ تمام جہانوں کے لئے باعث رحمت ہیں اور آپؐ کی نبوت عالمگیر اور ابد شناس بن گئی ہے۔ کیوں نہ ہو، سورج اگرچہ ہر صبح مشرق سے طلوع ہوتا ہے مگر وہ کسی ایک مقام پر رُکتا نہیں، مسلسل محو سفر رہتا ہے اور سفر کے دوران تمام مقامات کو منور کرتا جاتا ہے۔ یہی حال آفتابِ رسالت کی نورانی کرنوں کا

ہے۔ عرب کے علاوہ دنیا کے باقی علاقوں کے انسان بھی اِن کرنوں کی بدولت' ایمان و ایقان کی دولت سے اپنی جھولیاں بھرتے چلے جاتے ہیں۔

مغربی دانشوروں نے اس امر پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ہادیٔ برحق ﷺ کے خارجی حالات تو وقت کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہوتے رہے' مگر حضورؐ کی اپنی شخصیت اٹل' مستحکم اور غیر متبدل رہی۔ عام انسان حالات کی جبریت سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں' مگر عظیم انسان' خصوصاً اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر اور رسول' بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اپنے نظریات نہیں بدلتے بلکہ وہ زمانے کو اپنے عظیم مقاصد کے مطابق سازگار بنا کر دم لیتے ہیں۔ ہادیٔ برحق ﷺ نے نامساعد حالات کے دور میں بھی اعلیٰ اخلاق اور انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا۔ انہوں نے کسی حال میں بھی فقر و غنا اور تسلیم و رضا کے مسلک کو نہیں چھوڑا۔ اسی طرح خارجی حالات بھی ان کی شخصیت کا رخ اپنی جانب نہ موڑ سکے۔ یہ حضورؐ کے کردار کی بلندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو دنیا کے کسی بھی دور میں چند سالوں کے اندر اتنا عظیم اور اتنا دائمی انقلاب بپا نہیں ہوا جتنا اسلام کی وساطت سے ہوا۔ اس انقلاب کے اثرات کروڑوں انسانوں پر آج بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی تبلیغ حق کے تئیس (۲۳) سال کے قلیل عرصے میں عرب کے وحشی انسانوں کو مہذب' جاہلوں کو حکمت آشنا اور نفرت و عداوت کے حاملین کو محبت و صلح کا علمبردار بنا دیا تھا۔ یہی آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو ظاہری معجزات دیئے گئے تھے مگر رسول کریم ﷺ کو ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے معجزات سے نوازا گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار تھے اور ان کا مقام سب سے بلند تھا۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے ؎

حسنِ یوسفؑ' دمِ عیسیٰؑ' یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند' تو تنہا داری

مغربی مفکرین کے شبہات کا ازالہ کرنے کے عمل میں' فاضل مصنف قارئین کی

توجہ اس نکتے کی جانب مبذول کراتے ہیں کہ قرآن مجید نے عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے اور اس نے مطالعۂ کائنات اور مطالعہ تاریخ امم پر بہت زور دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان خدا کی نشانیوں کو کائنات میں دیکھ کر اس کی عظمت اور حکمت بالغہ کے قائل ہو سکیں۔ مصنف درست فرماتے ہیں کہ غور و فکر کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے کیونکہ سائنس نے اپنی محیرالعقول کامیابی کے علی الرغم، ہنوز بہت سی ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔ تسلیم، سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے، تاہم ابھی بہت سے حقائق ایسے ہیں جو اس کی گرفت سے باہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ حقائق کی جزوی اور محدود تحقیق سے عبارت ہیں، مگر اسلام کلیت (Totality) کا مظہر ہے، سائنس کا جزوی علم، کسی طور اسلام کی کلیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ عقل بلاشبہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے مگر اس کا دائرہ محدود ہے اور وحی اور الہام کے جملہ حقائق ہنوز اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اکثر مستشرقین اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی مکی زندگی تو تبلیغ و وعظ پر مبنی تھی مگر ان کی مدنی زندگی تبلیغ اسلام کی بجائے سیاسی روپ اختیار کر گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ان دانشوروں کو اس دونوں طرز کی زندگی میں کوئی مطابقت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ دانشور اسلام کی اصل انقلابی روح کو سمجھنے سے ہی قاصر ہیں۔ اسلام کے مزاج میں دین اور دنیا کے تقاضوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو قطعی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جب ہادیٔ اعظم ﷺ نے مکہ میں اللہ تعالیٰ کی وحدت اور اپنی رسالت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تو یہ اعلان تمام باطل نظام ہائے حیات کے لئے ایک زبردست چیلنج تھا۔ یہ صرف مروجہ عقائد، معاشرت، تہذیب، معیشت اور اخلاقیات ہی کی نفی نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کا ہدف باطل نظام سیاست کی مکمل طور پر بیخ کنی کرنا تھا۔

فاضل مصنف نے بعض مغربی مصنفین کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی

ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی نبوت حالات کا لازمی تقاضا تھی۔ یہ دانشور آنحضور ﷺ کی عظمت کو گھٹانے کے لئے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ زمانے کے حالات کو بدلنے میں حضور اکرم ﷺ کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی' کیونکہ ان کے بقول حالات پہلے ہی سے سازگار ہو چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ حالات پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے بلکہ حالات نے ان کی تحریک کو جنم دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر تعصّب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو عرب کی تاریخ ایسے مستشرقین کی اس غلط فہمی کی سختی سے تردید کرتی ہے۔ ان کی یہ بات تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے مترادف ہے۔ تمام غیر متعصب تاریخ دان اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے کے حالات صرف عرب میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی مذہبی' معاشرتی' اقتصادی' سیاسی' تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے سخت بحرانی کیفیت سے دوچار تھے۔ ہندوستان میں ذات پات کے ظالمانہ نظام' مصر میں استبدادی طرز حکومت' یونان کی بگڑی ہوئی تمدنی حالت' ایران اور روم کی استحصال پسندی اور تنگ نظری اور اہل مذہب کی سیاہ کاریوں نے انسان کی زندگی کو اجیرن بنا کر رکھ دیا تھا۔ عرب کی زبوں حالی اس حقیقت کی غماز تھی کہ آنحضور ﷺ کی بعثت کے وقت حالات قطعاً سازگار نہ تھے۔ آپؐ کی تشریف آوری سے قبل انسانیت ملوکیت' پاپائیت اور دیگر زنجیروں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ رسول اکرم ﷺ کا انسانیت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے اسے ان زنجیروں سے نجات دلائی اور قدیم فاسد نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا اور اس کی جگہ انصاف پر مبنی ایک نیا نظام متعارف کرایا۔

سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر تھا کہ جو عرب حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان کی کایا ایسی پلٹی کہ وہ ظلمت سے نور' جہالت سے علم' حماقت سے حکمت اور بدی سے نیکی کی جانب راغب ہو گئے۔ جب ان کے دل و دماغ کی دنیا میں انقلابِ عظیم آگیا تو پھر وہ قرآنی حقائق اور رسول اکرم ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ اسلام نے انہیں اخوت' مساوات' عدل و انصاف اور حریت کے

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید عراقی

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کے اوصاف و کمالات کا اعتراف ان کے معاصرین، علمائے فن، اربابِ سیر اور تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ علامہ ابن سبکی نے ان کو ائمہ ہدیٰ اور دین اسلام کے داعیوں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام بیہقی علم و فضل کا پہاڑ اور اپنے دور میں عدیم المثال، یکتائے روزگار، میدان علم کے شہسوار، حاذق الفن محدث اور علومِ اسلامیہ کے متبحر عالم تھے۔ (۱)

علامہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام بیہقی اپنے زمانہ میں یکتا اور اپنے معاصرین میں عدیم المثال تھے۔ (۲)

حافظ ابن عساکر فرماتے ہیں کہ امام بیہقی امام ابو عبداللہ حاکم صاحب المستدرک کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، تاہم متعدد علوم میں یکتا ہونے کی بنا پر اپنے استاد سے بڑھے ہوئے تھے۔ (۳)

حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی حافظ ابن عساکر کے قول کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ محدثین اور ارباب سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ امام ابو عبداللہ حاکم کے شاگرد امام ابوبکر بیہقی حدیث کی طلب و تحری میں ان سے فائق تھے"۔ (۴)

ولادت و وطن : امام ابوبکر احمد بن حسین شعبان المعظم ۳۸۴ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور کے مضافاتی قصبہ بیہق میں پیدا ہوئے۔ (۵)

تحصیل تعلیم : امام بیہقی نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ بیہق میں حاصل کی۔ بعد ازاں نیشاپور اور خراسان کے اساتذہ اور اکابر علماء و محدثین سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد عراق، حجاز، مکہ، بغداد اور کوفہ جاکر وہاں کے اساطینِ فن سے مستفیض ہوئے۔ (۶)

اساتذہ و تلامذہ : امام بیہقی نے جن نامور اساتذہ کرام سے استفادہ کیا ان کے نام حافظ ذہبی اور مؤرخ ابن خلکان نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام ابو عبداللہ حاکم صاحب المستدرک بھی شامل ہیں۔ ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ ان کے مشہور تلامذہ میں ان کے فرزند اسماعیل بن احمد اور پوتے ابوالحسن عبداللہ بن محمد بن احمد شامل ہیں۔ (۷)

علم و فضل : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کے حفظ و ضبط' عدالت و ثقاہت' امانت و دیانت اور اتقان پر محدثین اور ائمہ فن کا اتفاق ہے' اور جمہور محدثین کی رائے کے مطابق امام بیہقی اپنے زمانہ میں حفظ و ضبط میں یکتا' ضبط و اتقان کے اعتبار سے یگانہ اور ثقہ و قابل اعتماد تھے۔ اہل سیر اور تذکرہ نگاروں نے ان کو "الحافظ الکبیر" کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ (۸)

حدیث اور معرفتِ حدیث میں عدیم المثال تھے اور احادیث کے علل و اسقام کی تمیز میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ حدیث اور اس کے متعلقات میں اس درجہ عبور ہونے کی بنا پر ان کا شمار اکابر محدثین کرام میں ہوتا ہے۔ ابن عساکر نے ان کو شیخ السُّنّۃ کا لقب عطا کیا ہے (۹)۔ اور ظہیر الدین بیہقی نے لکھا ہے کہ فن حدیث میں ان کو اتنا عبور تھا کہ ان کے دور میں کوئی ان کا ہمسر اور ثانی نہیں تھا۔ (۱۰)

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ حدیث میں یگانۂ روزگار ہونے کی وجہ سے ان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ابن خلکان کے الفاظ یہ ہیں :

"غلب علیه علم الحدیث و اشتهر به" (۱۱)

(ان پر علم حدیث خاص طور سے غالب تھا اور اس میں ان کو نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔)

علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ امام بیہقی حدیث میں یگانۂ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے' ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں اور ان کی متعدد بے نظیر کتابیں بھی یادگار ہیں۔ (۱۲)

فقہ و اصول فقہ پر بھی ان کو مکمل عبور تھا۔ ان کی تصنیفات حدیث میں گوناگوں فقہی مسائل و معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ امام بیہقی نے اپنی

کتابوں میں علم حدیث و فقہ دونوں کے مسائل و معلومات جمع کئے ہیں۔ اس کے ساتھ علل حدیث، صحیح و سقیم روایات کی نشاندہی، احادیث کے درمیان جمع و تطبیق کے وجوہ اور فقہ و اصول فقہ وغیرہ مختلف النوع مباحث بیان کئے ہیں۔ (۱۳)

امام بیہقی کو عربیت اور شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق تھا۔ علامہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں ان کے حالات میں بہت سے اشعار نقل کئے ہیں۔ ایک شعر کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی وہ بزرگ ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے عزت طلب کی وہ ذلیل ہے۔" (۱۴)

امام بیہقی کو حدیث، فقہ، اصول فقہ، اور عربیت میں امتیازی شہرت حاصل تھی لیکن دوسرے علوم میں بھی ان کو کافی دسترس حاصل تھی اور تمام علوم میں اپنے معاصرین میں عدیم المثال، یکتا اور بے نظیر تھے۔ (۱۵)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کی ایک خصوصیت حقیقت بینی اور انصاف پسندی بھی ہے۔ علمائے فن اور ارباب سیر نے امام بیہقی کی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے۔ ظہیر الدین اپنی کتاب تاریخ بیہق میں لکھتے ہیں :

"تحقیقات در علوم بسیار دارد و در مباحثه و مناظره علوم غایت انصاف مرعی میداشت"۔ (۱۶)

(علوم میں بڑی تحقیق سے کام لیتے تھے اور مباحثہ و مناظرہ میں انصاف کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔)

درس و تدریس : امام بیہقی کے گوناگوں اوصاف و کمالات نے ان کی ذات کو مسلمانوں کا امام و مقتدیٰ اور اصحاب علم و فن کا مرجع بنا دیا تھا۔ اربابِ سیر نے ان کی امامتِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے علم و فن اور فضل و کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب امام بیہقی علوم اسلامیہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن بیہق میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے تو نیشاپور کے اصحاب علم و فن ان کی خدمت میں پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ آپ نیشاپور تشریف لے چلیں تاکہ آپ سے اصحابِ علم و

فن اور دوسرے لوگوں کو استفادہ کا موقع ملے۔ چنانچہ امام بیہقی نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور نیشا پور تشریف لے گئے۔ وہاں شائقین نے آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ اور جب مجلس درس آراستہ کی گئی تو بے شمار اصحاب علم و فن نے آپ سے استفادہ کیا' اور یہ سب لوگ آپ کے علم و فضل کے معترف تھے۔ (۱۷)

فقہی مذہب : امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی کا شمار شافعی مذہب کے اکابر ائمہ میں ہوتا ہے۔ ان کو اس مذہب سے غیر معمولی شغف تھا اور اس مذہب کی نشر و اشاعت اور اس کی تہذیب و تنقیح میں انہوں نے اہم اور نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ شافعی مذہب کو امام بیہقی کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ علمائے فن' ارباب سیر اور تذکرہ نگاروں نے مذہب شافعی کی ترقی و ترویج میں امام بیہقی کی کوششوں کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ کوئی شافعی المذہب انکی تصنیفات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ (۱۸)

علامہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں امام الحرمین ابو المعالی جوینی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ :امام بیہقیؒ کے علاوہ کوئی ایسا شافعی المذہب نہیں ہے جس پر امام شافعیؒ کے احسانات نہ ہوں' لیکن امام بیہقی کا خود امام شافعی پر احسان ہے' کیونکہ ان کی تصنیفات سے ان کے مذہب و مسلک کی بڑی تائید و اشاعت ہوئی ہے' وہ تمام شوافع میں اس مذہب کے اصول و فروع کی حمایت میں پیش پیش رہے ہیں اور اس کی تفریع و تخریج اور توضیح و تشریح کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ (۱۹)

علامہ ابن سبکی امام بیہقی کی خدمات کے سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : امام بیہقیؒ نے اپنی کتابوں میں امام شافعیؒ کے تمام نصوص جمع کردیئے اور اس قدر جامع اور مکمل طور پر مرتب کئے کہ بعد میں آنے والوں کے لئے مزید کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ (۲۰)

عقائد میں امام بیہقی اشعری المذہب اور اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔ انہوں نے اشعری مذہب کے مطابق علم کلام کی تحصیل کی۔ ابن عساکر نے ان کا شمار اشاعرہ کے تیسرے طبقہ کے علماء میں کیا ہے۔ (۲۱)

عادات واخلاق : امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی زہد و ورع، تقویٰ و طہارت، شمائل اور عادات و خصائل میں نہایت پاکیزہ تھے۔ عفت و قناعت، عبادت و ریاضت، امانت و دیانت اور عدالت و ثقاہت ان کی سیرت کے نمایاں پہلو تھے۔ وہ صحیح معنوں میں سلف صالحین اور علمائے ربانیین کے اوصاف کے حامل تھے۔

حافظ ابن عساکر نے "تبیین کذب المفتری" میں علامہ ابن عبد الغافر کا یہ بیان نقل کیا ہے : امام بیہقی علمائے سلف کی طرح معمولی اور تھوڑی چیز پر قانع اور زہد و ورع میں ممتاز تھے۔ وفات تک ان کا یہی حال تھا۔ (۲۲)

وفات : امام بیہقی نے ۷۴ سال کی عمر میں نیشاپور میں ۱۰ جمادی الاولیٰ ۴۵۸ھ کو انتقال کیا اور اپنے وطن بیہق میں سپرد خاک کئے گئے۔ (۲۳)

تصنیفات : امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی مایہ ناز مصنف تھے۔ ان کے فضل و کمال کا سب سے بڑا ثبوت ان کی تصانیف ہیں۔ علمائے فن اور تذکرہ نگاروں نے ان کی تصنیفات کو جامع، مفید، نفع بخش اور عدیم المثال بتایا ہے۔ امام بیہقی کا شمار ان ائمہ اسلام میں ہوتا ہے جن کی کتابوں سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ جن محدثین کرام کی تصنیفات کو عالم اسلام میں بقائے دوام حاصل ہوا ان میں امام بیہقی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

حافظ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ امام بیہقی نے عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کیں۔ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ امام بیہقی کی تصنیفات کو عالم اسلام میں بقائے دوام حاصل ہوا اور ان کی تصنیفات کو مختلف شہروں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں تصنیف و تالیف میں یکتا تھے (۲۴)

امام بیہقی صاحب تصانیف کثیرہ تھے، لیکن صاحبِ کشف الظّنون نے ان کی ۳۶ کتابوں کے نام بتائے ہیں مقالہ کے طویل ہونے کے خوف سے یہاں آپ کی صرف پانچ کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

i) کتاب القراءۃ خلف الامام : اس کتاب میں ان تمام روایات کو جمع کیا گیا ہے کہ

امام، مقتدی اور منفرد سب کے لئے، خواہ سری نماز ہو یا جہری، سورۃ الفاتحہ پڑھنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام بیہقی نے تمام روایات اور احادیث جمع کر کے شوافع کے مسلک کو قوی اور مرجح بتایا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں حدیث و رجال کی نئی بحثیں اور اہل لغت و ادب کے بیانات بھی نقل کئے ہیں۔

یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں مولانا تلطف حسین کے زیر اہتمام مطبع پرنٹنگ ورکس دہلی سے متوسط تقطیع پر ۱۷۶ صفحات میں شائع ہوئی۔ (۲۵)

ii) کتاب الاسماء والصفات : اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات پر مبسوط بحث کی گئی ہے اور ہر بحث سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ ضمناً تفسیر، کلام اور حدیث و رجال کی بعض فنی بحثیں بھی آگئی ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع انوار احمدی الہ آباد سے ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئی۔ (۲۶)

iii) شعب الایمان : اس کتاب کا پورا نام "الجامع المصنف فی شعب الایمان" ہے اور اس میں صحیحین کی مشہور حدیث "الایمان بضعٌ و سبعون شعبةً" کے مطابق ایمان کے ۷۰ شعبوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ نیز ہر ہر شعبہ کے متعلق دوسری روایات اور قرآنی آیات بطور استشہاد پیش کر کے ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے یہ کتاب بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔

iv) کتاب معرفۃ السنن والآثار : یہ امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کی معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ اس کتاب میں امام صاحب نے حدیث و سنت کی اہمیت، روایت اسناد میں احتیاط اور بعض ضروری فنی مباحث، اجماع، اجتہاد، قیاس، عام و خاص، امر و نہی، دلیل خطاب اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی نوعیت اور امام شافعی کے حالات و کمالات اور اجتہادی مرتبہ پر بحث کی ہے اور اس کے بعد فقہی ابواب کی ترتیب پر احکام و مسائل سے متعلق روایات جمع کی ہیں۔ حافظ ابن سبکی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کوئی شافعی المذہب اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

v) سنن کبریٰ : اسی کا دوسرا نام السنن الکبیر ہے، اور یہ امام بیہقی کی مایہ ناز اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ اس کی عظمت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحاح ستہ

کے بعد جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت اور بقائے دوام نصیب ہوا اس میں سنن کبریٰ بھی شامل ہے۔ حافظ ابن صلاح' امام سیوطی' شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس کتاب کی تعریف و توصیف کی ہے اور اس کو عمدہ اور پُر منفعت بتایا ہے۔ حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں :

"ما تمّ کتاب فی السنة اجمع للادلة من کتاب السنن الکبریٰ للبیهقی کانه لم یترک فی سائر القطار الارض حدیثا إلّا قد وضعه فی کتابه" (۲۷)

(دلائل کے لحاظ سے بیہقی کی سنن کبریٰ سے زیادہ جامع اور مکمل تصنیف حدیث و سنت کے ذخیرہ میں موجود نہیں۔ گویا امام صاحب نے تمام روئے ارضی کے چپے چپے سے حدیثیں اکٹھی کر کے انہیں اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے)۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں :

"سنن بیہقی فقہی مسائل و معلومات کا گنجینہ ہے۔ اس کے ابواب و تراجم فقہی مسائل ہی کے لحاظ سے قائم کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ایک حدیث سے مختلف مسائل کو مستنبط اور متعدد ابواب کی تفریع کی گئی ہے۔ اس سے امام بیہقی کے فقہی کمال اور اجتہادی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ صحابہ و تابعین کے آثار اور ائمہ مابعد کے اقوال و مسالک بھی جمع کئے گئے ہیں اور ضعیف و قوی اور مرجوح و راجح اقوال میں محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کے قدیم و جدید اقوال' شوافع کے مذاہب' اصول اور دلائل خصوصیت سے ذکر کئے گئے ہیں۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے امام شافعیؒ پر احسان کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے مختلف فیہ امور و مسائل کے متعلق صرف اپنے فقہی مسلک کی مؤید روایات و احادیث نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مذاہب کی موید حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے"۔ (۲۸)

حواشی

(۱) ابن سبکی' طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۳ (۲) ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵

(۳) ابن عساکر' تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ (۴) سید علی' تدریب الراوی' ص ۳۱
(۵) ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵ (۶) ابن عساکر' تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶
(۷) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۳۳۰۔ ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵
(۸) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۳۲۹۔ ابن عماد' شذرات الذہب' ج ۳' ص ۳۰۴
(۹) ابن عساکر' تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶
(۱۰) ظہیرالدین بیہقی' تاریخ بیہق' ص ۱۰۔ صدیق حسن خان' اتحاف النبلاء' ص ۱۹۰
(۱۱) ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵ (۱۲) سمعانی' کتاب الانساب' ص ۱۰۱
(۱۳) ابن عساکر' تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ (۱۴) ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵
(۱۵) ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵
(۱۶) ظہیرالدین بیہقی' تاریخ بیہق' ص ۱۰۔ صدیق حسن خان' اتحاف النبلاء' ص ۱۹۰
(۱۷) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۲' ص ۳۲۹ (۱۸) ابن سبکی' طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۴
(۱۹) ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵ (۲۰) ابن سبکی' طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۴
(۲۱) ابن عساکر' تبیین کذب المفتری ص ۲۶۷
(۲۲) ابن عساکر' تبیین کذب المفتری ص ۲۶۷
(۲۳) ابن جوزی' المنتظم' ج ۸' ص ۲۸۲۔ ابن خلکان' تاریخ ابن خلکان' ج ۱' ص ۳۵۔ ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۳۳۱
(۲۴) ابن کثیر' البدایہ والنہایہ' ج ۱۲' ص ۱۴۔
(۲۵) ضیاءالدین اصلاحی' تذکرۃ المحدثین' ج ۲' ص ۲۴۸
(۲۶) ضیاءالدین اصلاحی' تذکرۃ المحدثین' ج ۲' ص ۲۴۸
(۲۷) ابن صلاح' مقدمہ ابن صلاح' ص ۱۳
(۲۸) ضیاءالدین اصلاحی' تذکرۃ المحدثین' ج ۲' ص ۲۵۵

عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ :

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

آیت ۱۰۹ - ۱۱۰

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ : کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغہ 'الاعراب 'الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ بحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱ 'الاعراب کیلئے ۲ 'الرسم کیلئے ۳ اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر اکے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۱ : ۶۶ : ۲ الاعراب

بلحاظ مضمون اِس قطعہ کو سات جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں سے پہلے دو اپنے مضمون کی بناء پر دراصل ایک ہی جملہ بنتے ہیں۔ خیال رہے "الاعراب" کے بیان میں "جملہ" سے مراد کم و بیش ایک مستقل مضمون کی بناء پر باہم مربوط عبارت ہوتی ہے جس کا ایک معیار کسی علامت وقف کا استعمال ہے..... ورنہ خالص نحوی نقطۂ نظر سے تو محض ایک صیغہ فعل بھی مستقل جملہ (فعلیہ) ہوتا ہے۔ اِس طرح باعتبار مضمون اِس عبارت کے اجزاء (جملوں) کی تقسیم اور ہر ایک کی نحوی وضاحت یوں بنتی ہے :

❶ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا

[وَدَّ] فعل ماضی (واحد غائب مذکر) ہے [كثير] اِس کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے اِس لئے

آخر پر تنوین رفع (ـٌ) ہے [مِنْ اَھْلِ الکِتابِ] یہ پورا مرکب جاری (جس میں حرف الجر "مِن" کے بعد مجرور "اھل الکتاب" خود مرکب اضافی ہے یعنی "اھل" مضاف لہٰذا خفیف بھی ہے اور "الکتاب" مجرور بالاضافہ ہے) فاعل (کثیرٌ) کی صفت کا کام دے رہا ہے [لَوْ] حرف تمنّی (تمنا) ہے جسے "لَوْ مصدریہ" بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے بعد والے فعل کو مصدر مؤول کے معنی دیتا ہے۔ [یردُّونکم] میں "کُم" تو ضمیر منصوب مفعول بہ ہے اور فعل "یردُّون" مضارع کا صیغہ ہے جس میں ضمیر فاعلین "ھُمْ" بصورت واو الجمع مستتر ہے اور یہ عبارت "لَو یردُّونکم" فعل "وَدَّ" کا مفعول لہٰذا محلاً منصوب ہے۔ مصدر مؤول کی صورت میں عبارت "لَوْ یردُّونکم" (گویا) "رَدَّکم" (تم کو لوٹا دینا) سمجھی جائے گی یعنی "وَدَّ کثیرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ رَدَّکُمْ" (بہت سے اہل کتاب تم کو لوٹانا چاہتے ہیں) [مِنْ بَعْدِ...] جار (مِنْ) اور مجرور (بَعْد) مل کر ظرف ہیں (دراصل تو "بعد" ظرف زمان ہے جو مجرور بالجر ہو کر آیا ہے) اور "بعد" آگے مضاف بھی ہے (ہر ظرف عموماً مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے)

[ایمانِکم] مرکب اضافی ہے جس میں مضاف الیہ تو ضمیر مجرور "کُم" ہے اور کلمہ "اِیمان" جو آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف بھی ہو گیا ہے اپنے سے ماقبل ظرف (بعد) کا مضاف الیہ بھی ہے' اِس لئے اِس کی تنوین الجر (ـٍ) اب صرف ایک کسرہ (ـِ) رہ گئی ہے۔ [کُفَّارًا] فعل "یردُّون" کا مفعول ثانی ہے (مفعول اوّل "لو یردُّونکم" یا "رَدَّکم" تھا)۔ دراصل تو فعل "رَدَّ یَرُدُّ" (لوٹا دینا) کا مفعول ایک ہی ہوتا ہے لیکن یہاں چونکہ یہ "صَیَّرَ" (بنا دینا یعنی..... کو..... بنا دینا) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اِس لئے اِس کو دو مفعول الاٹ کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم بعض نحویوں نے اِس (کُفَّارًا) کو "یَرُدُّونکم" کی ضمیر مفعول (اول) کا حال قرار دیا ہے۔ اِس صورت میں ترجمہ ہوگا "لوٹا دیں تم کو کافر ہوتے ہوئے/ لوٹا دیں تم کو اِس حالت میں کہ (تم) کافر ہو دو" مگر اِس پیچیدہ ترکیب کو اکثر نحویوں نے "ضعیف" قرار دیا ہے۔ ویسے "حال" کا اردو ترجمہ بھی فہم سے بالاتر ہی رہ جاتا ہے جبکہ مفعول ثانی کی صورت میں اردو ترجمہ بھی آسان ہے' یعنی "وہ تم کو بنانا چاہتے ہیں کافر" اور ہمارے تمام مترجمین نے معمولی فرق عبارت کے ساتھ یہی ترجمہ کیا ہے۔

❷ "حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ"

یہ عبارت نہ تو بلحاظ مضمون ایک مستقل جملہ بنتی ہے (جو اپنا مطلب سمجھانے کے لئے کسی دوسری عبارت کا محتاج نہ ہو) اور نہ ہی نحوی اعتبار سے کوئی جملہ بنتا ہے (بلکہ نحوی لحاظ سے تو

صرف اِس کا آخری حصّہ "تبیَّنَ لھُمُ الحَقُّ" ہی جملہ بن سکتا ہے) دراصل یہ پوری عبارت سابقہ جملے (نمبر۱) پر' [جو بلحاظ مضمون بھی اور بلحاظ نحو بھی ایک مکمل جملہ ہے اور اسی لئے "کُفَّارًا" کے بعد وقف جائز کی علامت (ج) لکھی ملتی ہے] تبصرہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی کے مضمون کے بعض پہلوؤں کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ لہٰذا یہ نحوی اعتبار سے اسی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور یوں اسی جملہ (نمبر۱) کا ہی حصہ بنتی ہے اور اسی لئے سابقہ جملے کے آخر پر (کُفَّارًا کے بعد) علامت وقف جائز "ج" کے اوپر "صلے" (صلے) بھی لکھا جاتا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اگرچہ بلحاظ مضمون ایک جملہ ختم ہوتا ہے ، تاہم بلحاظ ترکیب نحوی (اعراب) اس کے مابعد والی عبارت بھی اسی (سابقہ جملے) سے ملی ہوئی بنتی ہے۔ اس عبارت کی وجوہ اعراب کچھ یوں ہیں۔ [حَسَدًا] مفعول لاجلہ (لَہٗ) ہے' اِس لئے منصوب ہے۔ علامتِ نصب تنوین نصب (ـً) ہے اور یہ فعل "وَدَّ" کا مفعول لہٗ بھی ہو سکتا ہے اور فعل "یَرُدُّوْنَ" کا بھی۔ پہلی صورت میں ترجمہ ہوگا "دل سے چاہتے ہیں..... ازراہِ حسد" یعنی "بہت سے اہل کتاب دل میں حسد رکھ کر / اپنے دل کی جلن سے / اپنے دلی حسد کی وجہ سے / یہ چاہتے ہیں" اِس میں "حَسَدًا" کا اصل ترجمہ تو "حسد رکھ کر / جلن سے / حسد کی وجہ سے" ہے۔ باقی "دل میں / دل کی / دلی" کا تعلق دراصل اگلی عبارت "مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ" سے ہے (چاہے "حَسَدًا" کو "وَدَّ" سے متعلق سمجھیں یا "یَرُدُّوْنَ" سے) اردو کے کم از کم تین مترجمین نے اسی طرح (یعنی "حَسَدًا" کو فعل "وَدَّ" کا مفعول لہ سمجھ کر) ترجمہ کیا ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ تاہم بیشتر مترجمین نے دوسری صورت یعنی "حَسَدًا" کو فعل "یردُّون(کُمْ)" کا مفعول لہٗ سمجھ کر ترجمہ کیا ہے یعنی تم کو دوبارہ کافر بنانے کی "کوشش" یا "عمل" (جس کا مفہوم خود فعل "رَدَّ" میں موجود ہے) کا باعث حسد ہے۔ یہ تراجم حصّہ اللّغۃ [۲:۶۶:۱(۳ اور ۴)] میں گزر چکے ہیں یعنی "..... کافر بنا دیں / کر ڈالیں تم کو محض حسد کی وجہ سے / حسد کی راہ سے جو ان کے نفسوں / دلوں میں ہے / دلی حسد کی وجہ سے / دلوں کی جلن سے" وغیرہ کی صورت میں----- ان میں سے بعض تراجم میں "جو" کا استعمال "حَسَدًا" کے نکرۂ موصوفہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور "ان کے نفسوں / دلوں / دلی / دلوں کی" کے الفاظ کا تعلق اگلی عبارت "من عندِ انفسِھم" سے ہی ہے' یعنی "حسد" کا سرچشمہ تو ان کے نفس (دل) ہی ہیں' چاہے یہ حسد "خواہش" (ودّ) کا باعث ہو یا "کوشش / عمل" (ردّ) کا باعث ہو۔

[مِنْ عِنْدِ.....] جار (مِنْ) اور مجرور (ظرفِ مضاف "عِنْدَ") ہیں جس کی وجہ سے "عِنْدَ" کی

دال کی کسرہ (ـِ) آئی ہے اور "مِنْ" یہاں ابتداء الغایۃ کے لئے ہے جسے مِنْ ابتدائیہ بھی کہتے ہیں۔ دیکھئے [۲:۲:۱(۵)] ..... یعنی یہ بتاتی ہے کہ اِس (حسد) کا منبع کہاں ہے؟--- اور یہ [... انفسِهم] ہے۔ یہ مرکب اضافی جس میں آخری "هُم" تو ضمیر مجرور ہے اور کلمہ "انفُس" سابقہ ظرف (عِندَ) کا مضاف الیہ ہونے کے باعث مجرور بھی ہے مگر آگے ("ھم" کی طرف) مضاف ہونے کے باعث اِس کی تنوین الجر (ـٍ) خفیف ہو کر صرف کسرہ (ـِ) رہ گئی ہے..... یوں اِس پورے مرکب جارّی (مِن عندِ انفُسِهم) کا تعلق "حَسَدًا" سے ہی ہے' چاہے "حَسَدًا" کا تعلق جس بھی فعل سے ہو۔ [مِنْ بَعْدِ مَا.....] "مِنْ بَعْدِ..." ابھی اوپر جملہ نمبرا میں (مِن بُعدِ ایمانِکم میں) گزرا ہے اور مندرجہ بالا "مِنْ عِنْدِ" کی نحوی پوزیشن بھی وہی ہے' یعنی حرف الجر (مِنْ) کے بعد ظرف (بُعْدُ/ عند) مجرور اور آگے مضاف ہیں۔ البتہ یہاں (زیر مطالعہ حصہ عبارت میں) اگلا مضاف الیہ کوئی ایک اسم یا مرکب اضافی (ایمانکم/ انفسهم کی طرح کا) نہیں بلکہ یہ مضاف الیہ "ما" سے شروع ہونے والا ایک جملہ فعلیہ ہے جس کے ساتھ یہ "ما" مصدریہ ہو کر اِس فعل کو مصدر مؤوّل بھی بنا سکتا ہے..... بعینہٖ اسی ترکیب (مِن بعدمَا.....) اور اِس کے "ما" کی مصدریت کے لئے دیکھئے البقرہ : ۷۵ [۲:۴۷:۱(۵)] اور اسی چیز (ما مصدریہ) کا ذکر یہاں بھی (ابھی آگے) ہوگا۔ [تَبَيَّنَ] فعل ماضی ہے۔ [لَهُمُ] یہ مرکب جاری (لام الجر "لِ" + ضمیر مجرور "هُم") اِس فعل (تبیّن) سے متعلق ہے۔ اِس (لِ) کا اردو ترجمہ اِس فعل (تبیّن) کے ساتھ بصورت "پر" کرنا پڑتا ہے..... دیکھئے اوپر [۲:۶۶:۱(۴)] میں۔ [الحَقُّ] فعل "تبیّن" کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے۔ اصل میں اِس کی سلیس عبارت "مِن بعد ماتبيَّنَ الحقُّ لهم" بنتی ہے۔ اردو ترکیب جملہ میں اِس "لهم" کا ترجمہ آخر پر بھی کر سکتے ہیں اور "مِن بَعدِمَا" کے فوراً بعد بھی اور "مَا" کو مصدریہ سمجھ لیں تو عبارت (مقدر یا مؤول) بنے گی۔ "مِن بَعدِ تبيّن الحَقِّ لَهُم" (بعد واضح ہو جانے حق کے ان پر/ حق کے ان پر واضح ہو جانے کے بعد) تاہم ہمارے اکثر مترجمین نے اِس (مصدریت والے) ترجمہ کو نظرانداز کرتے ہوئے "تبیّنَ" کا بطور فعل (ظاہر ہو چکا/ ہو گیا وغیرہ) ہی ترجمہ کیا ہے۔ صرف ایک ترجمہ بصورت "ظاہر/ واضح ہوئے پیچھے" آیا ہے' اِس میں "واضح ہوئے" بظاہر "واضح ہونے" کے (مصدری) مفہوم میں ہی آیا ہے اور یہ پورا مرکب (مِن بَعدِ ما تبیَّن لهُم الحق) بھی (حَسَدًا "مِن عِندِ اَنفُسِهِمْ" کی طرح) یا تو فعل "وَدَّ" سے متعلق ہے' یعنی حق واضح ہونے کے بعد بھی ازراہ حسد یہ خواہش رکھتے ہیں اور یا پھر فعل

"يَرُدُّوْنَ" سے متعلق ہے یعنی حق واضح ہونے کے بعد بھی ازراہ حسد اِس کوشش میں ہیں کہ تم کو لوٹا دیں۔ اسی کوشش کے مفہوم کو بعض مترجمین نے "کسی طرح لوٹا دیں / پھیر دیں" سے ظاہر کیا ہے۔ "لَوْ" کے "کاش کہ" میں بھی "یہ کس طرح" (کے عمل یا کوشش) کا مفہوم موجود ہے۔ اور چونکہ اِس پوری عبارت یا دونوں عبارتوں (حَسَدًا مِنْ عِنْدِ انفُسِهِم اور مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الحَقُّ) کا ترجمہ جملہ نمبرا کے فعل "وَدَّ" یا "يَرُدُّوْنَ" سے بنتا ہے اِس لئے اردو کے ایک آدھ مترجم نے عبارت کی اصل عربی ترتیب کی بجائے اجزائے جملہ کی اردو ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ "اکثر اہل کتاب (كَثِيرٌ مِن اَهْلِ الْكِتَابِ) باوجودیکہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے (مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الحَقُّ) اپنے دلی حسد کی وجہ سے (حَسَدًا من عندِ انفُسِهِم) چاہتے ہیں (وَدَّ)" کی صورت میں کیا ہے۔ مفہوم تو درست ہے مگر ترجمہ میں "محاورے کا بیڑہ" بھی واضح ہے۔

۲ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

[فَاعفُوا] "اُعْفُوا" (فعل امر حاضر) سے پہلے والی فاء (فَ) یہاں "فاء فصيحة" کے طور پر آئی۔ یعنی وہ فاء رابطہ جو کسی مقدر (غیر مذکور) شرط کے جواب کے طور پر آتی ہے۔ دیکھئے البقرہ : ۹۱ [۲ :۲: ۵۶ :۲ (۵)] میں۔ یہاں یہ مقدر شرط کچھ یوں بنتی ہے "اذا كان امرهم كذلك فاعفوا..." (جب ان کا معاملہ یوں ہی ہے تو....) یہاں "كذلك" ان کے اوپر بیان کردہ رویہ کے لئے ہے [وَاصفَحُوا] میں "و" عاطفہ ہے اور "اصفَحُوا" فعل امر حاضر ہے۔ یہاں ان دونوں افعال (اعفوا اور اصفحوا) کے مفعول محذوف ہیں۔ یعنی یہ نہیں بیان ہوا کہ "کن" سے اور ان کے "کون سے" فعل سے درگزر کرو' مگر سیاق عبارت سے "اہل کتاب کی اکثریت کے عزائم اور منصوبے" سمجھے جا سکتے ہیں۔ [حَتّٰى] یہاں بطور حرف نصب آیا ہے جس کے بعد ایک مقدر "اَن" کے باعث مضارع منصوب ہو جاتا ہے اور اسی لئے [يَاْتِيَ] فعل مضارع منصوب ہے۔ علامت نصب آخری "ی" (لام کلمہ) کی فتحہ (ــَـ) ہے۔ اور چونکہ "اَن" (یعنی "حتى اَن" والا مقدر) مصدریہ بھی ہوتا ہے اِس لئے مصدر مؤول کے ساتھ "حَتّٰى" (حرف الجر ہو کر) "حتّٰى يَاْتِى اللّٰهُ بامره" سے مقدر یا مؤول عبارت بصورت "حتّٰى اِتيانِ امرِ الله" (یعنی اللہ کے حکم آنے تک) بنے گی۔ تاہم یہ خواہ مخواہ کی فنی پیچیدگی اور محض فعل کا مصدر بنانے کی مشق ہے' اِس لئے ہمارے کسی مترجم نے بھی اسے اختیار نہیں کیا' بلکہ سب نے سیدھا سادہ فعل کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ اِس بناء پر اسم جلالت [اللّٰهُ]

یہاں اس فعل (یاتی) کا فاعل (اللہ) مرفوع ہے۔ [بامرِہٖ] کی ابتدائی باء (بِ) وہ صلہ ہے جو فعل "اَتی ۔ آنا" پر لگ کر اسے "..... کو لانا' لے آنا" کے معنی دیتا ہے۔ باقی حصہ "امرہ" مرکب اضافی ہے جس میں "امر" مضاف ہے جو باء (بِ) کی وجہ سے مجرور اور آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف بھی ہے' یعنی اس کی تنوین ایک کسرہ (ـِ) میں بدل گئی ہے اور آخر پر ضمیر مجرور (ہ) ہے۔ یوں یہ پورا مرکب جاری (بامرِہ) متعلق فعل "یاتی" ہے اور آپ اسے اس کا مفعول (لہذا محلاً منصوب) بھی کہہ سکتے ہیں۔

❹ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ..... بعینہٖ یہی جملہ سب سے پہلے البقرہ : ۲۰ میں آیا تھا اس کے اعراب کے لئے دیکھئے [۲:۱۵:۲] کے آخر پر۔

❺ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ..... بعینہٖ یہی عبارت جو دو جملوں پر مشتمل ہے سب سے پہلے البقرہ : ۴۳ میں گزری ہے۔ اس کی اعرابی بحث کے لئے دیکھئے [۲:۲۹:۲] میں جملہ نمبر۲۔ اس کے بعد یہی عبارت البقرہ : ۸۳ میں بھی آئی تھی ، جس کے اعراب پر بات [۲:۱] [۵۱:۲] میں جملہ نمبر۵ میں ہوئی تھی۔

❻ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ

[وَ] مستانفہ ہے۔ یہاں سے ایک الگ مضمون شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے اس سے پہلی عبارت کے آخر پر وقف مطلق (ط) ہے۔ [مَا] موصولہ شرطیہ ہے بمعنی "جو کچھ بھی کہ" جو یہاں اگلے فعل الشرط (تُقَدِّموا) کا مفعول مقدم ہو کر محل نصب میں ہے۔ مبنی ہونے کی وجہ سے "مَا" میں ظاہراً کوئی علامت نصب نہیں ہے۔ [تُقَدِّمُوا] فعل مضارع مجزوم (صیغہ جمع مذکر حاضر) ہے۔ جزم کی وجہ اس سے پہلے اسم الشرط جازم (مَا) کا آنا ہے اور اس (فعل الشرط) کی علامت جزم آخری نون (اعرابی) کا گر جانا ہے۔ اب اس کے واو الجمع میں ضمیر الفاعلین "انتم" شامل ہے۔ [لِاَنفُسِکم] یہ مرکب جارّی جو لام الجر (لِ) + انفُس + کم کا مرکب ہے اور جس میں "انفسکم" مرکب اضافی ہے اور "انفس" مجرور اور آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف بھی ہے۔ علامت جر کسرہ (ـِ) ہوگئی ہے۔یہ پورا مرکب جاری (لانفُسِکم) فعل "تقدِّموا" سے متعلق ہے اور [مِن خَیر] جار (مِن) + مجرور (خَیرٍ) مل کر اِس فعل (تُقَدِّمُوا) کے مفعول مقدم (مَا) کی صفت یا تمیز ہے جس میں "مِن" تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور بیانیہ بھی۔ دیکھئے [۲:۲:۱ (۵)] یہاں تک کہ حصہ عبارت (وَما تقدِّموا لانفسِکم مِن خیرٍ) کی سلیس و سادہ شکل (فعل فاعل مفعول کی عام ترتیب کے مطابق)

"وَما تقدِّموا من خیرٍ لانفُسِکم" ہوتی۔ اب "لِانَفُسِکم" کی تقدیم سے اس میں "اپنی ہی جانوں کے لئے/ اپنے ہی لئے" کا مفہوم ہے۔ [تَجِدُوہُ] کی آخری "ہ" تو ضمیر منصوب (مفعول) ہے اور "تَجِدُوا" (ضمیر مفعول کے بغیر واو الجمع کے بعد الف الوقایہ لکھنا ضروری ہوتا ہے) فعل مضارع مجزوم ہے۔ جزم کی وجہ جوابِ شرط میں آنا ہے اور علامتِ جزم آخری نون کا گرنا ہے (دراصل صیغہ مضارع "تَجِدُون" تھا) اور واو الجمع میں ضمیر الفاعلین "انتم" موجود ہے۔ یہاں فعل "وجَد یجِد" صرف ایک مفعول کے ساتھ بمعنی "پا لینا/ حاصل کرنا" آیا ہے۔ [عندَ اللّٰہِ] میں "عِنْدَ" ظرف مکان مضاف (لہٰذا) منصوب ہے' علامت نصب "د" کی فتحہ (ـَـ) ہے اور اسم جلالت اِس کا مضاف الیہ ہو کر مجرور ہے اور یہ مرکب ظرفی فعل "تَجِدُوا" سے متعلق ہے' یعنی اِس میں "کہاں/ کس جگہ پاؤ گے" کا جواب ہے۔

۷ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ---- اِس سے ملتا جلتا جملہ "وَاللّٰہُ بصیرٌ بما یَعْمَلون" البقرہ : ۹۶ میں گزرا ہے جس کے اعراب پر [۲:۵۹:۲] کے جملہ نمبر۵ میں بات ہو چکی ہے۔ بہرحال یہاں جملہ [اِنَّ] حرف مشبہ بالفعل سے شروع ہوتا ہے اور اسم جلالت [اللّٰہَ] اِس "اِنَّ" کا اسم ہو کر منصوب ہے۔ [بِمَا] باء جارہ یہاں فعل (بصُربِہ - کو دیکھنا) کے صلہ والی ہے اور "مَا" اسم موصول مجرور (بِالبَاء) ہے اور "مَا" مبنی ہے' اِس لئے اِس میں ظاہراً کوئی علامت جر نہیں ہے۔ [تعمَلوُن] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" شامل ہے اور یہ جملہ فعلیہ (فعل فاعل) ہو کر موصول ہے جس میں ضمیر عائد محذوف ہے' یعنی دراصل "تعمَلونَہٗ" تھا۔ اور یہ صلہ موصول (مَا تعمَلون) باء الجر کے ساتھ (بصورت "بِمَا تعمَلوُن" متعلق خبر مقدم ہے اور [بَصِیرٌ] خبرِ"اِنَّ" (لہٰذا) مرفوع ہے جملے کی سادہ نثر "اِن اللّٰہَ بصیرٌ بما تعمَلون" بنتی ہے جس میں رعایت فاصلہ کی بناء پر متعلق خبر (بما تعمَلون) کو مقدم کر دیا گیا ہے۔ خیال رہے فعل "یبصُربِ اور صفتِ مشبہ "بصیرٌ بِ..." دونوں کا مطلب تو "... کو دیکھتا/ دیکھنے والا" بنتا ہے مگر صفت مشبہ میں دوام و استمرار کا مفہوم ہے جیسا کہ حصّہ "اللّغۃ" میں بیان ہوا۔

۲ : ۶۶ : ۳ الرّسم

بلحاظ رسم زیر مطالعہ قطعہ میں صرف چار لفظ قابل ذکر ہیں یعنی "الکتٰب' ایمَانکم' الصلٰوۃ اور الزکٰوۃ"---- ان میں سے "ایمانکم" کا رسم عثمانی مختلف فیہ ہے۔ باقی تین کا رسم متفق علیہ ہے۔ یہ چاروں الفاظ پہلے بھی گزر چکے ہیں--- "الکتٰب" کے رسم کے لئے

دیکھئے البقرہ : ۲ [۲:۱:۳] میں نمبر۲۔ "ایمانکم" کے لفظ "ایمان" کے رسم کے اختلاف کے لئے دیکھئے البقرہ : ۹۳ [۲:۵۷:۳] میں نمبر۶۔ "الصلوۃ" کے رسم پر بحث کے لئے دیکھئے البقرہ : ۳ [۲:۲:۳] میں نمبر۱ اور پھر "الصلٰوۃ اور الزکٰوۃ" دونوں کے رسم کے لئے دیکھئے البقرہ : ۴۳ [۲:۲۹:۳] میں نمبر۲۔

۲ : ۶۶ : ۴ الضبط

اِس قطعہ سے صرف بعض چیدہ الفاظ (مفرد و مرکب) کے ضبط بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔ اکثر الفاظ پہلے متعدد بار گزر چکے ہیں یا ان کے ضبط میں صرف حرکات کی شکل کا اختلاف ہے۔

اَهْلِ الْكِتٰبِ/ اَهْلِ الْكِتٰبِ، اَهْلِ الْكِتٰبِ/ كُفَّارًا، كُفَّارًا/ اَنْفُسِهِمْ، اَنْفُسِهِمْ، اَنْفُسِهِمْ/ تَبَيَّنَ، تَبَيَّنَ/ الْحَقُّ، اَلْحَقُّ، الْحَقُّ/ فَاعْفُوْا، فَاعْفُوْا، فَاعْفُوْا/ وَاصْفَحُوْا، وَاصْفَحُوْا، وَاصْفَحُوْا/ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ/ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ/ لِاَنْفُسِكُمْ/ لِاَنْفُسِكُمْ، لِاَنْفُسِكُمْ۔

بقیہ : تعارف الکتاب

معجزہ جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا وہ قائم و دائم ہے، تا قیامِ قیامت رہنے والا ہے، بلکہ تا قیامت ہی نہیں، ابد الآباد تک کے لئے ہے۔ اس لئے کہ روایات میں آتا ہے کہ اہلِ جنّت سے اللہ تعالیٰ قرآن حکیم سنیں گے اور قرآن مجید کے پڑھنے والوں سے فرمائیں گے کہ قرآن پڑھو اور بلند سے بلند مراتب کی طرف ترقی کرتے چلے جاؤ، تمہارا آخری قیام وہ ہو گا جہاں تم قرآن مجید کی آخری آیت پڑھو گے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن مجید کی عظمت کو پہچاننا چاہئے کہ یہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

بقیہ : رسول اکرم ﷺ ' مغربی اہل دانش کی نظر میں

زرس اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور کر دیا تھا۔ کلمۂ توحید کے انقلابی پیغام نے نبی اکرم ﷺ کے مخاطبین اور عقیدت مندوں میں فکر و عمل کی وسعت پیدا کر کے انہیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا تھا۔

فاضل مصنف نے مغربی مستشرقین کے خیالات ان قارئین تک پہنچا کر جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں' ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ اب وہ اولین فرصت میں اس کتاب کو انگریزی کے قالب میں بھی منتقل کریں تاکہ اہل مغرب بھی اسلام کی انقلابی روح سے متعارف ہو سکیں۔ ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ مصنف کو ان موضوعات پر تحقیقی کام کرنا چاہئے جن کے بارے میں اہل مغرب کے ذہنوں میں متعدد شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ تسلیم' مسلمان دانشوروں نے اس سمت میں کافی سرگرمی دکھائی ہے' مگر ہنوز' بات ابتدائی مراحل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ مسلمان حکومتوں پر بھی فرض ہے کہ وہ اسلامی ممالک کے مذہبی سکالروں کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ دین حق کا چراغ چار سو اپنی روشنی عام کر سکے۔

(تبصرہ نگار : کرنل غلام سرور' ڈائریکٹر ریسرچ "فرینڈز"
پوسٹ بکس ۲۹۹ راولپنڈی کینٹ)

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Annual Subscription in Pakistan: Rs. 100/-
Price per issue: Rs. 30/-

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore
36-K, Model Town, Lahore-54700 Phone: 5869501-3; Fax: 5834000
E-Mail: anjuman@brain.net.pk

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

کی تازہ ترین تالیف

برِعظیم پاک و ہند میں

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

اور اس سے انحراف کی راہیں

جس میں

- اسلام کے ابتدائی انقلابی فکر اور اس میں زوال کی تاریخ کے جائزے کے بعد
- علامہ اقبال کے ذریعے اس کی تجدید اور مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے ہاتھوں اس کی تعمیل کی مساعی اور ان کے حاصل، اور
- "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ میں ناگزیر تدریج اور اس کے تقاضوں" کے علاوہ
- اس فکر سے انحراف کی بعض صورتوں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے ——————!

سفید کاغذ پر ۱۰۴ صفحات، مع دیدہ زیب ہارڈ کور — قیمت فی نسخہ /۳۰

نبی اکرمؐ کی اصل جلالت قدر اور عظمت شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:

کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اس اہم موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

مطبوعہ

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

هدیہ فی نسخہ: ۶ روپے تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

July. 1998 Reg. No. CPL. 126

MONTHLY Vol. 17
Hikmat-e-Quran
LAHORE No. 7

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاھور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـ اور ـ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ